یہ منصوبہ بندی، ربوہ میں تیار ہوئی، پروگرام اسرائیل میں بنا، آخری شکل امریکہ میں دی گئی ○ عمل پاکستان میں ہوا ○ حکومت دشمن عناصر کو اسمبلی میں واک آؤٹ...



# جیل سے بھٹو کا آخری انٹرویو

جو آج تک دنیا کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا

## جنرل ضیاء کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات اور سنگین الزامات

جو پہلی بار منظر عام پر آتے ہیں

## شاہ احمد نورانی نے ۵ کروڑ اور رفیق باجوہ نے ۱۰ لاکھ روپے سیاسی رشوت کے طور پر طلب کئے

جماعت اسلامی، جمعیت العلمائے اسلام، تحریک استقلال اور این۔ ڈی۔ پی نے مفاہمت سے انکار کر دیا۔ اصغر خان نے فوج کے اشارے سے کام بگاڑا اور مذاکرات ناکام ہو گئے۔

میں اور جنرل ضیاء ایک تھے۔ گل خان نے کام خراب کر دیا۔ میں نے مارشل لاء کی اجازت دی اور جنرل نے اقتدار کے گھوڑے پر سوار ہو کر مجھے کچلنے کا فیصلہ کر لیا

افسوس کہ میں جنرل ضیاء کے قرآن اور شاہ حسین کی سفارش سے دھوکہ کھا گیا۔ امریکی سفیر نے رات بھر مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ اور جنرل ضیاء نے کام دکھا دیا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے پہلے ۵، ۶ جولائی کا درمیانی وقت تھا میں جنرل عارف کو اس تحریک کا نشانہ بنا رہا تھا مگر ضیاء نے منصوبے پر ایک دن قبل ہی پانی پھیر دیا۔ جب پرائم منسٹر ہاؤس کے باہر فوج آ گئی تو جنرل نے کہا سر یہ سب کچھ آپ کے حکم سے ہوا۔ اب آپ کی گرفتاری کا ناگوار فریضہ بھی حکم سے ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ پھر وہ اور آپ ایک خوفناک شکنجے میں جکڑے ہیں یہ تھا میرے خلاف فوجداری مقدمہ

اصغر خان، مرزا شوکت حیات کی سازش، بھٹو اور مفتی محمود کی خفیہ ملاقات کی رپورٹ، بیگم بھٹو کی واپسی اور آخری اقدام بھٹو اور شورش کاشمیری کے تعلقات

اور

اسی قسم کے متعدد قومی واقعات سے پردہ اٹھانے والی حیرت انگیز، پراسرار اور ناقابل فراموش داستان


ماہنامہ
تبصرہ
لاہور

ماہ نامہ
لاہور
# تبصرہ

ایڈیٹر اختر کاشمیری

قیمت ۲ روپے





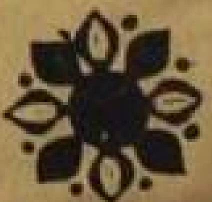
رابطہ آفس
۲۳۹ اتاترک بلاک
نیو گارڈن ٹاؤن
لاہور


ایڈیٹر
اختر کاشمیری

مینیجنگ ایڈیٹر
جانباز مرزا

قانونی مشیر
عبدالمجید قریشی
جی فوید

جلد: ۲۰

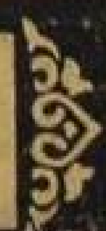
شمارہ ۱۰، ۱۱
اگست
ستمبر
۱۹۷۹ء


# جناب صدر!

آپ کو اپنا کہا تو بہر حال یاد ہوگا آپ نے برسرِ اقتدار آتے ہی "چادر اور چار دیواری" کی حفاظت کا اعلان فرمایا - آپ کی تشریف آوری بقول آپ کے "نظریۂ ضرورت" کے تحت روا ٹھہری - آپ نے ۹۰ روز تک اس نظریہ کے تحت اقتدار میں رہنے کا وعدہ کیا مگر افسوس کہ اب یہ نظریہ ضرورت آپ کے اپنے وجود سے زیادہ قد آور ہوگیا ہے ـــــ آخر کیوں؟

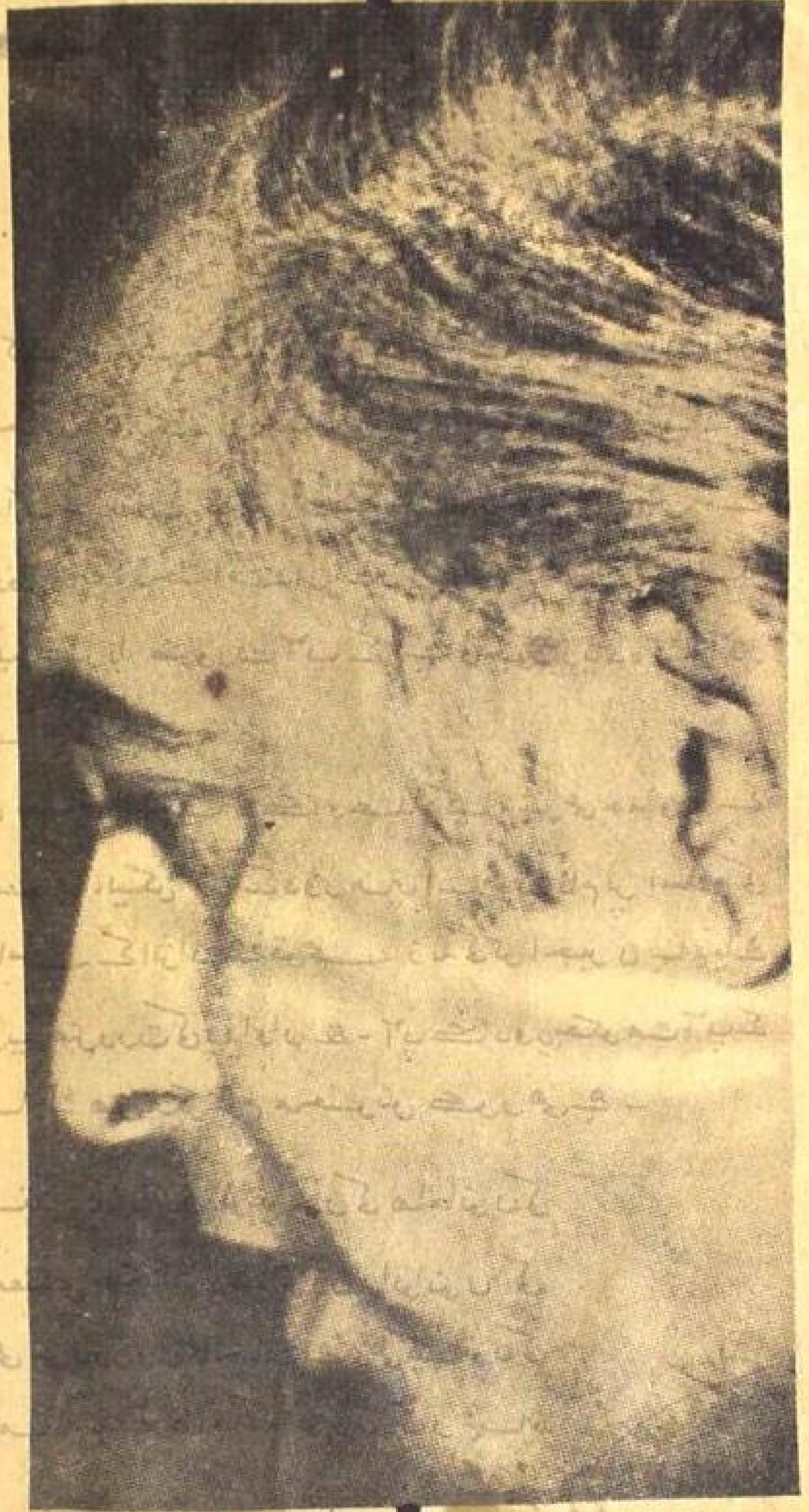
آپ نے اسلامی نظام کے نفاذ کا وعدہ کیا - شرعی حدود کے اجرا کا فیصلہ سنایا، لیکن آپ کے دور میں اسلام کے نام پر اسلام کی جو بھد اُڑ رہی ہے اس کے اثرات نے قومی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے کیا یہ سب کچھ نظریہ ضرورت کی پیداوار ہے - آپ کا دورِ حکومت آپ کے نزدیک شاید بڑا مبارک ہو مگر قوم محسوس کر رہی ہے -

ابھی تو پرستش ہوتی ہے فرعونوں کی ہامانوں کی
مجبور ہے مفلس جھکنے کو دہلیزوں پر ایوانوں کی
عالم ہے وہی مزدوروں کا، حالت ہے وہی کسانوں کی
کہتے تھے زمانہ بدلے گا اب تک تو کوئی آثار نہیں


رابطہ آفس : ۲۳۸ - اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور فون: ۸۵۴۴۴۸


# جیل سے
# بھٹو کا
# آخری انٹرویو

راوی :
محمد شریف



یہ انٹرویو چند بکھرے ہوئے سوالات اور منتشر جوابات کی صورت میں لیا گیا تھا۔ یہ کام اوّل تا آخر ہمارے قانون دان دوست جناب جی فرید نے انجام دیا۔ ہم نے اس کے بعض حصے بوجوہ حذف کیے اور سوال جواب ختم کر کے ایک مربوط مضمون بنا دیا ہے۔

اس کے تمام مندرجات سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے بعض قومی رہنماؤں کے بارے میں بھٹو کا اظہار خیال ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ جس سے ہر شخص کو اتفاق یا اختلاف کا حق حاصل ہے۔ ذاتی طور پر ہم قطعاً غیر جانبدار ہیں۔ اس کی اشاعت کو ہم نظریۂ ضرورت کے تحت ہم جائز سمجھتے ہیں۔

تحریر :
جی فرید ایڈووکیٹ



## پہلا منظر

"... اور مسٹر یہ کیا نام ہے تمہارا، یہاں کیسے آئے؟" جو کوٹ لکھپت جیل لاہور میں اچھلتے، کودتے ایک نوجوان کے عقب میں آواز گونجی، یہ نوجوان محمد شریف بلا تھا، جو جیل میں مسٹر بھٹو کے احاطے سے ملحقہ بیرک میں بند تھا، وہ آواز سن کر گھوما تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور بدن میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے سامنے پاکستان کے سابق وزیر اعظم بھٹو تھے، جو اپنی کوٹھڑی میں لگے آموں کے درختوں کے سایہ میں کھڑے تھے اور ساتھ والی بیرک کے لان میں اس نوجوان کو قلا بازیاں کھاتا دیکھ کر بے ساختہ بول پڑے تھے۔

شریف یہ تو جانتا تھا کہ چند روز پہلے سابق وزیر اعظم کو گرفتار کر کے اسی جیل میں لایا گیا ہے۔ لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ سابق وزیر اعظم اس کے اس قدر قریب ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر شبہ ہونے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ یا تو وہ خواب دیکھ رہا ہے یا اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ خیر گذری کہ مسٹر بھٹو کی آواز زیادہ بلند نہ ہوئی ورنہ شریف کا یہ خواب ایک ہی لمحے میں چکنا چور ہو جاتا۔ شریف بلا چند ثانیے ٹکٹکی لگائے بھٹو کو دیکھتا! پھر اس نے سنبھل کر جواب دیا کہ میرا نام محمد شریف بلا ہے اور قتل کے جرم میں یہاں بند ہوں۔

قتل اور جرم کے الفاظ سنکر بھٹو کے چہرے پر ایک عجیب اور … سا تاثر پیدا ہوا مگر جلد ہی انہوں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔ البتہ شریف کے عرفی نام "بلا" سے وہ کافی محظوظ ہوئے۔ اس وقت شاید انہیں خیال آیا ہو گا کہ وہ بھی قتل ہی کے الزام میں گرفتار ہوئے ہیں، اور حالات نے ایک وزیر اعظم اور شریف بلے کو ایک ہی کشتی کا سوار بنا دیا ہے۔ اب شریف کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ خواب میں نہیں بلکہ عالم ہوش ہی میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ شاید یہ سلسلہ کلام کچھ آگے بڑھتا لیکن اسی اثنا میں بیرک میں ملاقات کا پرچہ آ گیا۔ بلا وزیر اعظم کو چھوڑ کر اپنے ملاقاتی سے ملنے چلا گیا اور وزیر اعظم دیوار سے ہٹ کر روپوش ہو گئے۔ ان دنوں مسٹر بھٹو نئے نئے جیل میں آئے تھے اور جیل حکام اس … بارے میں رازداری سے کام لے رہے تھے کہ مبادا کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ مگر اسی رازداری میں شریف کے سامنے جو سربستگی ہوئی تھی، اس کا کسی شخص کو علم نہ ہو سکا، سوائے شریف کے ماموں محمد علی کے، جو اسی روز شریف سے مل کر آیا تھا اور شریف نے اسے ہنستے ہوئے آج کا واقعہ سنایا تھا۔ محمد علی نے اس سلسلے میں نہ صرف خود ہی زبان بند رکھی بلکہ شریف کو بھی سمجھایا کہ وہ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرے کیونکہ اگر جیل حکام کو پتہ چل گیا تو وہ اسے میانوالی یا ساہیوال جیل میں بھیج دیں گے اور عزیزوں کے لیے اس کی ملاقات مشکل ہو جائے گی۔

بلا حسب معمول روزانہ صبح و شام دوڑتا، بھاگتا، ورزش کرتا، بیٹھکیں اور کاہے ماہے بڑھکیں بھی لگاتا تھا اور مسٹر بھٹو چونکہ ایسی جگہ قید تھے جہاں ان کے پاس کوئی آدمی ہوتا تھا نہ آدم زاد۔ احاطے کے باہر اور جیل کے کورٹ موقع پر سنتری ہوتے تھے، لیکن بھٹو ان کی طرف دیکھتے ہی نہیں تھے۔ وہ ان کی موجودگی اور ان سے نظر ملانا اپنی توہین سمجھتے تھے، لیکن تنہائی پھر تنہائی ہے، "یہ کسی نہ کسی طرف آنکھ اٹھانے اور کسی نہ کسی متنفس سے..."







ایسے کہ جن کے شب و روز بات چیت میں گزرتے تھے۔

کہاں وہ رات دن کی رنگینی اور کہاں یہ بے چارگی اور تنہائی کی سنگینی جو وہ اپنا اس روح فرسا تنہائی میں پہرہ داروں کی غفلت سے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ یہی تھا کہ کبھی کبھی ساتھ والی بیرک میں خوش فعلیاں کرنے والے اس نوجوان کو دیکھ لیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر شریف کا منہ چونکہ بھٹو کی طرف ہوتا تھا اس لئے جب کوئی پہرہ دار ادھر کو آتا دکھائی دیتا تو وہ شریف کو انگلی کے اشارے سے اسطرح خاموش رہنے کی تلقین کرتے جیسے ان سے بات کرنے کے جرم میں اس پر کوئی آفت آپڑے گی۔ ممکن ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ وہ وزیر اعظم ہیں۔ اگر کسی نے ان کو اس اخلاقی مجرم سے ہمکلام ہوتے دیکھ لیا تو ان کی بیعزتی ہوگی۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس حالت میں وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو یہ تماشہ ختم ہو جائے گا اور پھر وہی جان لیوا تنہائی ان کا تعاقب کرے گی۔ ادھر بلا بھی اسی خیال کے تحت.... رازداری سے کام لیتا رہا کہ اگر اسے سابق وزیر اعظم سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔

ایک ہی جرم میں ملوث ایک بڑے آدمی اور ایک عام شہری میں فرق کے باوجود یہ سلسلہ سلام و کلام چلتا رہا۔ کبھی کبھی مسٹر بھٹو کوئی سگریٹ کا پیکٹ یا کھانے پینے کی کوئی چیز بلے کی طرف پھینکتے تو وہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود اسے قبول کر لیتا لیکن اتنے قیمتی سگریٹ اس نے پہلے کبھی نہیں پیئے تھے۔ اسی لیئے مفت لئے ہوئے یہ سگریٹ وہ بیت الخلاء میں جا کر پھونکتا تھا تاکہ کوئی دوسرا قیدی دیکھ کر یہ نہ سوچنے لگے کہ اتنے قیمتی سگریٹ اس کے پاس کہاں سے آئے ہیں، کیونکہ ملاقات کے دوران بلے کے لیئے جو چیز یا سگریٹ آتے تھے۔ ان کا بیرک کے دوسرے قیدیوں کو علم ہوتا تھا۔

**دوسرا منظر**:- بلا چنا بازار لاہور کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ اپنے ایک رشتہ دار کے قتل کے جرم میں جیل گیا۔ کچھ عرصے بعد ضمانت پر رہا ہو کر گھر آگیا۔ مگر پھر ۱۹۷۷ء میں دوبارہ گرفتار ہو کر کوٹ لکھپت جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ جب بھٹو جیل گئے تو قدرت نے انہیں ایسی کوٹھڑی میں جگہ دی جس کی دیوار بلے کی بیرک سے ملی ہوئی تھی یہ بلے کی خوش قسمتی تھی یا کوئی اور بات کہ بھٹو اس کی خوش فعلیوں کے باعث اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ورنہ اس بیرک میں اور بھی افراد موجود تھے جنکی طرف مسٹر بھٹو کبھی متوجہ نہ ہوئے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک روز کچھ دوسرے قیدیوں نے بھی بھٹو کو دیکھ لیا بھٹو نے انہیں اپنی طرف متوجہ پاکر اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ بلند کر کے "تالی بجائی"۔ جس کا جواب قیدیوں نے "بھٹو جیو ہزار سال" کی صورت میں دیا۔ اس روز شام کے کھانے کی تقسیم کے وقت بھٹو بھی ایک برتن اٹھا کر کھانا لینے والے قیدیوں کی



بات کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لہٰذا اوقات آدمی خود کلامی بھی کرنے لگتا ہے خود بھٹو کو بارہا خود کلامی کرتے ہوئے سناگیا۔ بھٹو بھی بہر حال انسان تھے اور انسان بھی:





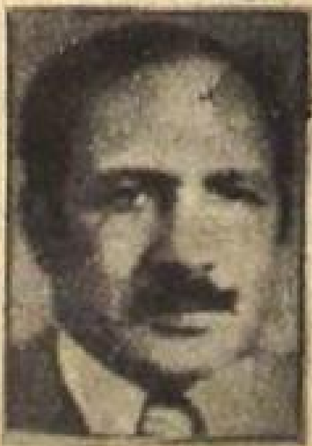




لائن میں آ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے عوام کے ساتھ لائن میں کھڑے ہو کر کھانا لیں گے۔ حالانکہ ان کا کھانا بیگم بھٹو گلبرگ سے خود ہی تیار کروا کر بھجوا کرتی تھیں۔ جو جیل حکام معائنے کے بعد ان تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ جیل کے اندر حکام نے بھٹو کو ایک مشقتی دے رکھا تھا جو ان کے لیے کافی۔۔۔ وغیرہ تیار کرتا تھا۔ بھٹو کے اس تازہ ڈرامے پر جیل کی اس بیرک میں "تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو نعرے لگنے شروع ہو گئے اور جیل حکام اس بیرک کو قیدیوں سے خالی کرانے پر مجبور ہو گئے۔ جس وقت یہ بیرک خالی کروائی جا رہی تھی، بلا بیرک کے دوسرے تمام مکینوں کے خلاف سرگرم عمل دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہیڈ وارڈن اور نمبرداروں کو بتایا کہ وہ ایک خاموش طبع اور امن پسند سا آدمی ہے۔ اسے شور و غل اور نعرہ بازی پسند نہیں۔ جو اس بیرک کے قیدی کر رہے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسی بیرک میں قیام پذیر رہا اور دوسرے قیدیوں کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا۔ منتقل ہونے والے قیدی بلا کی اس حرکت کا مقصد سمجھتے تھے اور اشاروں ہی اشاروں میں اس کی ذہانت کی داد دے رہے تھے۔ لیکن مصلحت یہی تھی کہ وہ خاموش رہیں۔ اس کے بعد بھٹو اور بلے کی ملاقاتیں طویل سے طویل ہوتی چلی گئیں اور بلا بھٹو کے لیے تنہائی کے اس کربناک ماحول میں ایاز بن گیا۔ لیکن قیدیوں کی منتقلی کے بعد کئی روز تک بھٹو اور بلے کی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور بلا جیل حکام کی نگرانی کے باعث دبکا بیٹھا تھا۔ لیکن تنہائی پتھروں کا بھی پتا پانی کر دیتی ہے۔ بھٹو تو بہر حال گوشت پوست کے انسان تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ بلا بھی یہاں سے جا چکا ہے۔ ایک دن بے خیالی میں ان کی نظر بیرک کے صحن میں پڑی تو دیکھا کہ بلا اپنی چکی کے باہر بیٹھا لسی سے روٹی کھا رہا ہے۔ بھٹو نے "تلی ہوئی مچھلی کا ایک پیس مومی لفافے میں ڈال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ بلا اپنے عظیم محسن کو دیکھ کر مسکرایا۔ مسٹر بھٹو بھی مسکرائے اور اس طرح تعلقات کی پھر سے تجدید ہو گئی۔

## ہمارا منصوبہ

ایک روز شام کے وقت جب میرا منشی محمد علی میرے دفتر میں مجھے یہ دلچسپ کہانی سنا رہا تھا تو نقیب ملت کے ایڈیٹر اختر کاشمیری بھی آ پہنچے۔ انہوں نے جب یہ واقعہ سنا تو مجھے ایک کام کے بہانے دفتر سے اٹھا کر ایک قریبی ہوٹل میں لے گئے وہاں جا کر انہوں نے بتایا کہ اگر محمد علی ہماری مدد کرے تو بھٹو اور بلے کے موجودہ تعلقات کے دوران بھٹو صاحب سے بہت سی باتیں پوچھی جا سکتی ہیں اور یہ باتیں مستقبل میں ہماری قومی تاریخ کا ایک دلچسپ باب بن جائیں گی۔ محمد علی سے اختر کاشمیری کے ذاتی مراسم بھی تھے چنانچہ جب ہم دونوں نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ مان گیا۔ طے پایا کہ بلے کو دوران ملاقات چند سوالات دیئے جائیں جو وقتاً فوقتاً وہ بھٹو سے پوچھتا رہے اور دوسری ملاقات میں اس کی زبانی جو کچھ معلوم ہو اسے قلمبند کر لیا جائے۔ ہر چند کہ میرے نزدیک یہ کام مشکل بھی تھا اور خطرناک بھی، ہمارے لیے کم اور شریف کے لیے زیادہ اور بھٹو کے لیے شاید سب سے زیادہ۔ لیکن اختر صاحب کے اصرار پر مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ چنانچہ ایک ہفتے بعد محمد علی کے ہمراہ مجھے بھی بلے کی ملاقات کے لیے جانا پڑا۔ میں نے اسے سوالات ذہن نشین کرائے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی سمجھایا کہ یہ تمام سوالات کی صورت میں یا کسی ایک ہی موقع پر نہ کئے جائیں بلکہ وقفوں وقفوں









سے بے ترتیب انداز میں ایک ایک بات کی صورت میں بھٹو صاحب سے پوچھے جائیں اور اُن پر یہ کسی صورت میں ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ کسی پروگرام کے تحت ان سے یہ سوالات کئے جا رہے ہیں۔ یہ ہدایات دینے کے بعد ہم بلے سے رخصت ہو کر آ گئے۔ پھر پندرہ روز بعد بلے سے جو ہماری ملاقات ہوئی تو ہمارے سامنے ایک ایسی داستان آ گئی جو طلسم ہوشربا سے کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔ اس کے بعد ہر ملاقات میں ہم بلے کو نئے نئے سوالات دیتے رہے اور بلا نہایت ہوشیاری سے بھٹو سے یہ سوالات پوچھتا اور انکے جوابات یاد کرتا رہا۔ ایک دفعہ کوئی بات اسے دوبارہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بھٹو حیران رہ گئے۔ انہوں نے کہا بلے تم بہت ذہین آدمی ہو۔ جب تم مجھ سے باتیں کرتے ہو تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں کسی پریس کانفرنس میں بیٹھا کسی اخبار نویس کے سوالات کا جواب دے رہا ہوں۔

## بھٹو کو شک پڑ گیا

کہنے کو تو بھٹو نے بلے سے بڑی مختصر بات کہی لیکن درحقیقت آج انہیں بلے کے بارے میں شک ہو گیا تھا کہ:

وہ کہیں حکومت کا مخبر ہی نہ ہو۔ ان کے اس شک کے لیے کئی جواز موجود تھے۔ بلے کا زیادہ تر سیاسی موضوعات پر ہی باتیں کرنا۔ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بڑے ماہرانہ سوالات پوچھنا۔ کم و بیش روزانہ ان کا آپس میں باتیں کرنے اور کسی کو اس کی آج تک خبر نہ ہونا۔ بیرک کے تمام قیدیوں کی منتقلی کے باوجود بلے کی وہاں پر موجودگی وغیرہ۔ چنانچہ اگلے روز بھٹو نے ملاقات کے دوران بلے کو صاف صاف کہہ دیا کہ تم ایسی باتیں مجھ سے مت کیا کرو۔ کیا تم سیاسی بکواس کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ بلے نے کہا صاحب! آپ سیاسی آدمی ہیں۔ اس لیے میں آپ سے ایسی باتیں کرتا ہوں۔ میرے ساتھ رہنے والے تمام قیدی چور چکار اور ڈکیت تھے۔ میں ان کے ماحول سے تنگ تھا جب سے آپ یہاں آئے ہیں میں آپ کے سوا کسی سے کوئی بات نہیں کرتا۔ اگر آپ ناراض ہیں تو میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا اور آئندہ اس طرف آ کر آپ کو اپنی شکل بھی نہیں دکھاؤں گا۔ یہ تمام باتیں اس نے کچھ اس سادگی اور بے ساختگی سے کیں کہ بھٹو صاحب کا شک رفع ہو گیا۔ کیونکہ بلا ایک سیدھا سادا سا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے اسکی سادگی اور شرافت کی گواہی ملتی تھی اور بھٹو صاحب بڑے جہاندیدہ اور قیافہ شناس انسان تھے۔ ان کے تجربے نے بتایا کہ بلا ایسا نہیں ہو سکتا۔ واقعتہً بات بھی یہی تھی۔ بلا بیچارہ معمولی تھا۔ اس کے عامل جیل سے باہر تھے اور حکومت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ملاقاتوں اور باتوں کا یہ سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا اور اس وقت تک جاری رہا تھا آنکہ بھٹو پنڈی جیل میں منتقل ہو گئے۔

## اور بھٹو چلے گئے

مسٹر بھٹو کے پنڈی جیل چلے جانے کے بعد میں نے اپنی کارگزاری کا لفافہ اختر صاحب کے سپرد کر دیا لیکن وہ بضد تھے کہ مجھے پنڈی جا کر کوئی ذریعہ تلاش کر کے بھٹو صاحب سے فلاں فلاں مسئلے پر مزید معلومات حاصل کرنی چاہیں۔ میں پنڈی گیا وہاں میں نے جن لوگوں سے رابطہ قائم کیا جیسے جیسے پاپڑ بیلے یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال مجھے وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا۔ پنڈی میں بھٹو صاحب سے ملاقات کے لیے کسی قیدی نمبردار وغیرہ کو تلاش کرنا ممکن تھا لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ بھٹو صاحب اسے منہ بھی لگاتے ہیں یا نہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا تھا۔ وہ ایک معجزہ تھا اور معجزے روز روز یا اپنی مرضی سے ظاہر نہیں ہوا کرتے۔ میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ بلے کی ملاقات کا دن آ گیا۔ اس سے پہلی ملاقات میں وہ میں اس کے



پاس نہیں جا سکا تھا۔ اس نے میرے نہ آنے کا شکوہ کیا۔

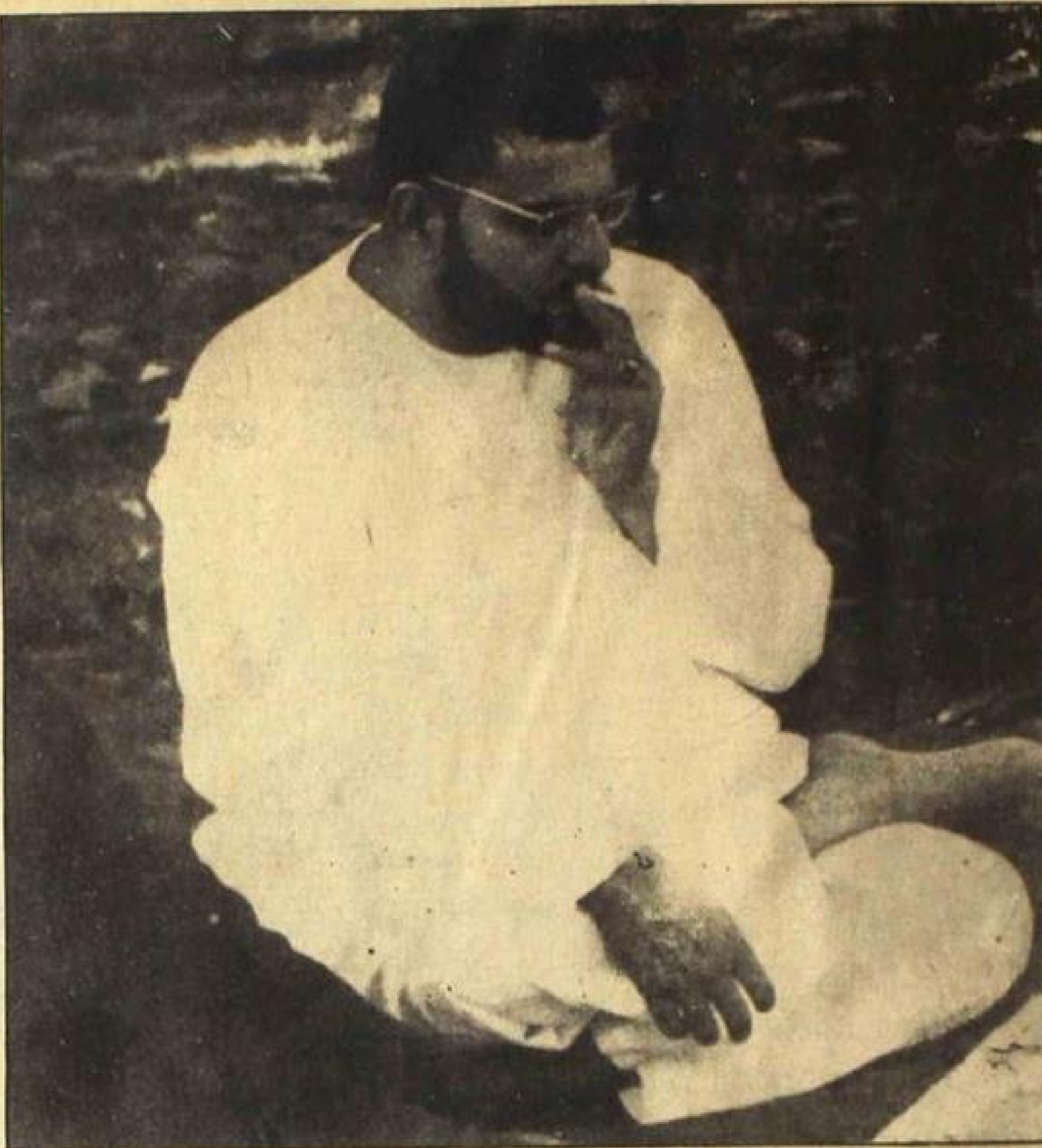
آج کے روز بلے سے مل کر مجھے جو بے پایاں خوشی ہوئی تھی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خوشی کی لذت میں آج تک محسوس کر رہا ہوں بلے نے اپنے جیل کے ذرائع سے خود ہی بھٹو صاحب سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور وہ اس امر پر بے حد مسرور تھا۔ بلے نے ہماری ہزار کوشش کے باوجود اپنے پنڈی کے ذرائع کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ اپنی کہانی کے ابواب وہ مکمل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بھٹو کی سزائے موت پر عمل درآمد ہو گیا۔ بلے اور بھٹو کے مابین جو سوال و جواب ہوئے ان میں بھٹو کی ذاتی، خاندانی، سیاسی زندگی سے لے کر ملکی اور بین الاقوامی مسائل تک شامل ہیں۔ اب آپ جیل کی دنیا میں جنم لینے والی اس انوکھی کہانی کے سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں۔

## سوال و جواب

بلے نے سوال کیا، آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے خلاف قائم ہونے والا مقدمۂ قتل ایک سیاسی کیس ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ نے اپنے دورِ حکومت

# عجب شے ہے واللہ

کوثر نیازی



میں اپنے سیاسی مخالفین پر ظلم ڈھائے۔ سیاسی حریفوں کو رسوا کیا۔ اپنے رفقاء کو بے آبرو کر کے حکومت سے نکال باہر کیا۔ یہاں تک کہ اپنی جماعت کے ایک سابق رکن احمد رضا قصوری پر اپنی سپیشل فورس ایف۔ ایس۔ ایف کے اہل کاروں سے حملہ کروایا جس کے نتیجہ میں اسکا باپ نواب محمد احمد مارا گیا۔ اس کے باوجود آپ کا یہ دعویٰ کہ یہ مقدمہ سیاسی ہے۔ بے وزن نظر آتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں بھٹو صاحب کا کہنا تھا کہ :-

## میرے خلاف امریکی سازش

جن لوگوں نے امریکہ کے اشارے پر میری حکومت کے خلاف تحریک چلائی۔ ان کو اس ملک میں دن رات ہر طرف بربریت کے مناظر نظر آتے تھے۔ وہ سوتے جاگتے مجھے اور میرے وزراء کو ظالم اور جفا جو کہتے رہے۔ لیکن ان کو میری حکومت کی کوئی خوبی یا کارنامہ نظر نہ آیا۔ آخر کیوں؟ یہاں پہلے بھی بڑی بڑی حب الوطنی کی دعوے دار حکومتیں برسر اقتدار آئیں۔ لیکن کسی ایک حکومت نے بھی ملک کا وقار بلند کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا؟ کوئی عالمی سربراہی کانفرنس بلا کر عالم اسلام کے اتحاد کے لئے راہ ہموار کی؟ میں نے غریب لوگوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا۔ جینے کی امنگ دی۔ آزادی کا ولولہ بخشا۔ میں نے سابقہ حکومت کی نااہلی کے سبب بھارتی قید میں جانے والے بانوے ہزار جوانوں کو نجات دلائی جو محض ایک حکومت

کی غلط سیاسی پالیسیوں کے باعث ہتھیار ڈال کر گرفتار ہو گئے تھے۔ میری حکومت نے بیج سے پابندیاں اٹھا کر لاکھوں مسلمانوں کو حج کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ میں نے نوے سالہ قادیانی مسئلہ سیاسی سطح پر حل کر دیا۔ اس فیصلے کے بعد بیرونی دنیا بالخصوص اسرائیل اور امریکہ میں کام کرنے والے قادیانی اداروں نے مجھے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کروانے کی دھمکیاں دیں۔ اس فیصلے کے بعد حزب اختلاف کے ایک بہت بڑے صحافی شورش کاشمیری مرحوم نے اپنے اخبار (چٹان) میں واضح طور پر لکھا کہ قادیانیوں نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے اور بھٹو کو قتل کروانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ حکومت کا وعدہ معاف گواہ مسعود محمود بھی... قادیانی ہے؟

آج یہ الزام بھی مجھ پر لگایا جاتا ہے کہ میری سپیشل فورس، ایف ایس، الف نے تحریک کے دوران یا اس سے پہلے سیاست دانوں اور دوسرے بے گناہ شہریوں پر ظلم و ستم کیا۔ لیکن خود یہی لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران قادیانی جوانوں نے فوجی وردیاں پہن کر لوگوں کا قتل عام کیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میری حکومت کو بدنام کرنے کے لیے مسعود محمود قادیانی نے اپنی جماعت کے اشارے پر الیف۔ ایس۔ الیف کے قادیانی جوانوں سے خود ہی یہ تمام مظالم کرائے ہوں۔ آخر یہ کب ضروری ہے کہ ملک میں جتنے بھی چھوٹے بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں

وہ وزیر اعظم کے ایما پر ہوتے ہیں یا وہ ان سے باخبر ہوتا ہے؟

مسٹر احمد رضا قصوری کی مشہور احراری لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے رشتہ داری ہے۔ ان کی ایک بیٹی یا نواسی احمد رضا کے گھر ہے۔ کیا یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ احمد رضا قصوری پر حملے کے پیچھے بھی یہی قادیانی سوچ کارفرما ہو؟

میں عدالت میں یہ نہیں کہوں گا کہ قادیانی اس واقعے کے ذمہ دار ہیں، اگرچہ میں اس چیز کے حق میں دلائل دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر میں نے یہ راز فاش کر دیا تو یہ میرے ملک کے حق میں مفید نہ ہو گا، کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قادیانیوں نے میرے خلاف جو سازش کی ہے اگر وہ طشت از بام ہو گئی تو اس کے بعد وہ جس منصوبے پر عمل کریں گے اس سے ملک میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ البتہ میں اتنی بات بتا رہوں کہ اس منصوبے میں مسٹر عبدالسلام، ایم ایم احمد، چوہدری ظفر اللہ اور خود مرزا ناصر احمد شامل ہیں۔ قادیانیوں کا لندن پلان۔ یہ منصوبہ لندن میں تیار ہوا، اسرائیلی مشیروں کی نگرانی میں طے پایا اور امریکی سی آئی اے کے ذریعے سے عملی جامہ پہنایا گیا۔ کیا جنرل ضیاء اس بات سے انکار کریں گے کہ انہوں نے بلوچستان کے قادیانیوں کو خوش کرنے کے لیے جس گورنر کا وہاں پر تقرر کیا ہے وہ قادیانی ہے اور مفتی محمود اس سلسلے میں ان سے زبانی احتجاج بھی کر چکے ہیں۔ لیکن مفتی محمود جنرل کے خلاف وہ ہنگامہ نہیں کروا سکے جو میرے خلاف کرواتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ جنرل کی پشت پر امریکہ جیسی طاقت موجود ہے۔

## جنرل ضیاء اور امریکہ

کیا دنیا میں کوئی مثال موجود ہے کہ کسی فوجی جنرل کو غیر آئینی طریقے سے ملک کے صدر کا عہدہ سنبھالنے پر امریکہ نے مبارکباد دی ہو، جبکہ جنرل ضیاء نے پاکستان کے صدر کا عہدہ سنبھالا تو سب سے پہلے امریکی صدر جمی کارٹر نے انہیں مبارکباد دی۔ کیا اس سے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ امریکہ موجودہ حکومت کی پشت پناہی کر رہا ہے اور امریکہ ہی نے میری آئینی حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک چلوائی تھی۔

قومی اتحاد کے لیڈر جو سیاسی میدان میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ بھی موجودہ فوجی ٹولے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے مجھے قاتل قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں اور چوہدری ظہور الٰہی ان میں سب سے آگے ہے۔ حالانکہ چوہدری ظہور الٰہی کا مجھ سے صرف یہی اختلاف ہے کہ میں جاگیرداروں کے خلاف ہوں اسی وجہ سے چوہدری کو بھی اپنی ناجائز طریقے سے بنائی ہوئی جاگیریں خطرے میں نظر آتی ہیں۔ آخر ایک ہیڈ کانسٹیبل کروڑپتی کیسے بن گیا؟ کیا کوئی ہیڈ کانسٹیبل جائز طریقے سے کروڑوں روپے کی جاگیریں بنانا تو الگ رہا اپنا ذاتی مکان بھی بنا سکتا ہے۔ چوہدری ظہور الٰہی کو مجھ پر ایسا الزام عائد کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی کیونکہ ذاتی طور پر چوہدری نے کرائے کے قاتل پال رکھے ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی نے اپنے نوکر کو کن خدمات کے صلے میں گلبرگ میں کوٹھی بنا کر دی ہے۔ ان خدمات سے کون نہیں واقف۔ یہ وہی خدمات ہیں جو حنیف رامے یا خان قیوم اپنے ساتھیوں سے لیتے ہیں۔ وہی خدمات میرے جو دولتانہ اپنے ساتھیوں سے لیتا رہا۔ اگر قومی اتحاد والے سچے ہیں تو انہوں نے اپنی تحریک کے دوران مجھ پر یہ الزام کیوں نہیں عائد کیا۔

سوال یہ ہے کہ قومی اتحاد نے میرے اتنے بڑے اور گھناؤنے جرم کو قوم کے سامنے کیوں نہیں پیش کیا۔ وہ میری شراب نوشی پر تقریریں کرتے رہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں گناہ گار ہوں، لیکن ان لوگوں کے نزدیک شراب نوشی قتل سے بڑا جرم ہے؟ جو لوگ میری شراب نوشی پر وعظ کر سکتے تھے، انہوں نے میرے قتل جیسے بڑے جرم پر کیوں زبان بند رکھی اور اب فوجی حکومت کے زیرِ سایہ انکی زبانیں کیوں کھل گئیں۔

## یہ سیاسی یتیم ہیں

میں ان لوگوں سے ہرگز خوف زدہ نہیں۔ میں باہر نکلا تو ان سب بدمعاشوں کو میدان میں شکست دوں گا۔ یہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ الزام تو لگا سکتے ہیں لیکن میرے مقابلے میں سیاست نہیں کر سکتے۔ یہ سیاسی یتیموں کا ایک ٹولہ ہے جس میں نوابزادہ نصر اللہ کے سوا کسی کو سیاسی بصیرت نہیں ہے۔ میرے تو باپ دادا سیاست دان اور حکمران چلے آ رہے ہیں اور خود یہ سیاست دان بھی مجھ سے سیاست سیکھ کر میرے مقابلے میں آ اٹھے ہیں۔ اگر یہ لوگ سچے ہوتے تو مجھے میدان میں کام کرنے دیتے۔ میں پھر دیکھتا کہ ان میں کتنا دم خم ہے؟

## دن کو گالیاں رات کو بھیک

ان سیاست دانوں کا کردار یہ ہے کہ یہ دن کو جلسوں میں مجھے گالیاں دیتے تھے اور رات کو چور دروازوں سے آ کر مجھ سے خیرات بھی لے جاتے تھے۔ میں نے کبھی بھی ان کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ خیرات باہر جا کر میرے ہی خلاف استعمال کریں گے، لیکن میں اتنا کم ظرف نہیں تھا کہ اپنے دروازے پر آنے والوں کو دھتکار دیتا۔

## رفیق باجوہ کو ۱۰ لاکھ دیے

میں نے رفیق باجوہ کو بھی مایوس نہیں کیا۔ باجوہ نے کہا آپ نظامِ مصطفیٰ بتدریج نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کے حق میں اپنی خطابت کے زور پر ملک بھر میں فضا ہموار کر دوں گا۔ ملک بھر میں جلسوں کے انتظامات پر دس لاکھ روپے صرف ہوں گے۔ مسٹر باجوہ قسم کھائیں کہ کیا میں نے انہیں خالی ہاتھ بھیجا ہے؟ حالانکہ یہی باجوہ قومی اتحاد کے پلیٹ فارم پر مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیتے رہے۔

جب بھٹو سے یہ پوچھا کہ کیا جنرل ضیاء بھی امریکی حکومت کے آلہ کار ہیں تو بھٹو نے اثبات میں جواب دیا۔ اور جب یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ کو اس بات کا علم تھا تو آپ نے انہیں آرمی کا چیف آف سٹاف کیوں بنایا؟ اس سوال کے جواب میں بھٹو نے ایک طویل کہانی سنائی جو حسبِ ذیل ہے۔

## جنرل ضیاء کا قرآن اور ترقی

یہ بات تو مجھے حکومت سے الگ ہونے کے بعد معلوم ہوئی کہ جنرل ضیاء امریکہ کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ جب تک میں حکومت میں تھا مجھے ان کے کردار کے



بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا جہاں تک انہیں چیف آف سٹاف بنانے کا تعلق ہے، تو اس کی دو وجوہات تھیں۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ ایک بار میں ملتان کے دورے پر گیا تو مسٹر صادق حسین قریشی کے اصرار پر میں ان کے یہاں قیام پذیر رہا، ایک روز مجھے ایک میجر جنرل کی طرف سے ملاقات کی درخواست ملی، میں نے مصروفیات کے باعث ملاقات سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز پھر اسی جنرل کی درخواست آئی تو میں نے اس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ میجر جنرل ضیاء الحق ہے۔

میں نے اگلے روز ان کو ملاقات کا وقت دے دیا، تیسرے روز جب وہ ملاقات کے لئے میرے پاس آئے تو میں مسٹر قریشی کے مطالعہ کے کمرے میں تھا۔ میں نے ضیاء الحق کو وہیں بلا لیا، ضیاء الحق جب کمرے میں داخل ہوئے تو پہلے انہوں نے مجھے فوجی سلوٹ کیا اس کے بعد آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے دونوں ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگالیا۔ ابھی میں ان کے اس انداز ملاقات پر سوچ ہی رہا تھا۔ کہ وہ تیزی سے قریب پڑی کتابوں کی الماری کی طرف بڑھے اور وہاں سے قرآن پاک اٹھا کر لائے اور پھر قرآن پاک میرے سامنے میز پر رکھ کر کہنے لگے:۔

"سر میں اس قرآن پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں آپ کا سب سے زیادہ... وفادار ہوں" آپ میرا آئیڈیل ہیں، میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ آپ اپنے دور کے سلطان صلاح الدین ایوبی ہیں، آپ نے بھارت جیسے خطرناک دشمن سے ہمارے جوانوں کو آزاد کرا کر پاکستان کو دنیا میں سربلند کر دیا ہے۔"

میں نے جنرل کی اس لمبی چوڑی تقریر سے اکتا کر ان کو خلوص اور عقیدے سے متاثر ہو کر انتہائی شفقت سے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن وہ بیٹھنے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹ کر "ب" کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا جنرل بتاؤ! تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے، ترقی چاہتے ہو، کسی بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیئے باہر بھجوانا چاہتے ہو بولو، میں تمہاری ہر طرح مدد کرونگا۔

ضیا بولے۔ "سر میں کچھ نہیں چاہتا، میں صرف آپ کو دیکھنے آیا تھا، ملاقات کی خواہش تھی سو وہ پوری ہو گئی۔ اب اجازت ——— میں نے انہیں بڑی گرم جوشی سے معانقہ کر کے رخصت کیا، میں اس شخص کی بے ساختہ اپنائیت سے بہت متاثر ہوا اور اس وقت میں نے اس شخص کی حرکات کو ایک عقیدت مند کی جذباتی کیفیت سمجھا اور زندگی میں غالباً پہلی بار میں نے قرآن پاک کی قسم کھانے والے اس شخص سے دھوکہ کھایا ——— اور میں نے اس کا نام اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

## شاہ حسین کی سفارش

چند ماہ بعد ایک روز میں فوج کے سینئر اور جونیئر افسران کی فائلیں دیکھ رہا تھا کہ سامنے ضیاء الحق کی فائل بھی آگئی یہ ایک جونیئر افسر تھا، لیکن اس کی فائل پر اردن کے شاہ حسین نے جنرل ضیاء کی خدمات کی تعریف کی تھی اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ جنرل ضیاء ترقی کا مستحق ہے یہ سفارش انکی اس خدمت کے عوض تھی کہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان کی طرف سے وہ اردنی فوج کو تربیت دینے کے لیے وہاں گئے تھے۔ ان دنوں اردن اور فلسطینی محاذ آزادی کے درمیان کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ اس موقعہ پر جنرل ضیاء نے غالباً فلسطینیوں کو دبانے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ اس لیے شاہ حسین نے ان کی ان خدمات کو دیکھ کر اپنے شاہانہ مزاج کے مطابق ان کے لیئے یہ سرٹیفکیٹ لکھ دیا۔ میں نے اس سفارش کو تین بار پڑھا، پھر میں نے یہ سوچ کر کہ جو شخص احکامات کی پابندی کر کے فلسطینی محاذ کے خلاف اردنی فوج کو لڑا سکتا ہے وہ اپنے ملک کی فوجوں کو دشمن کے مقابلے میں نسبتاً بہتر طور پر تیار کرنے کا اہل ہوگا اور اس کے ساتھ ہی ان کی وہ ملاقات بھی یاد آئی جو ملتان میں ہوئی تھی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس جنرل کو ترقی دینی ہے، یہ ترقی دینے کے لیئے میرے پاس یہ جواز موجود تھا کہ جنرل ضیاء دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہوئے تھے مگر ۱۹۶۲ء میں یہ بیس سالہ کارکردگی کے باوجود صرف لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ دھوک کر بریگیڈیئر بن سکے۔ ۱۹۷۱ء میں جب میں برسر اقتدار آیا تو میں نے ان کو کسی سفارش کے بغیر ہی میجر جنرل بنا دیا۔ اب ایسا موقع تھا کہ اگر میں اس طویل سروس والے جنرل کو چیف آف سٹاف بنا دیتا تو مجھ پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا چنانچہ ۱۹۷۵ء میں میں نے انہیں بلا کر اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انہوں نے یہ ذمہ داری اٹھانے سے کافی سنجیدگی سے انکار کر دیا اب میرا ارادہ ان کے بارے میں اور بھی پختہ ہو گیا، ان کا انکار میرے نزدیک ان کی اہلیت کی دلیل تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں اپنا ارادہ،

نہیں بدلوں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک ان کا انکار ان کی اہلیت کا آئینہ دار ہے۔ اس واقعے سے میرے دل میں اس شخص کا احترام پیدا ہوگیا اور میں نے اسے آرمی کا چیف آف سٹاف مقرر کر دیا۔

## جنرل ضیاءؒ اور مارشل لاءؒ

مارچ ۱۹۷۷ء کی تحریک کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ جنرل نے کہا ہنگاموں پر قابو پانے کے لیئے مارشل لاء لگا دینا چاہیئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آئین میں مارشل لاء کی گنجائش نہیں۔ اس پر جنرل ضیاء بولے کہ جب مارشل لاء لگ جائے گا۔ تو آئین کو کون پوچھے گا۔ یہ چند صفحات کا ایک پلندہ ہے جسے پھاڑ کر پھینکا جاسکتا تھا۔ ملک کی حفاظت آئین سے زیادہ ضروری ہے۔ رجعت پسند مولویوں اور طالع آزما سیاست دانوں نے توڑ پھوڑ سے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہم کب تک اس صحیفۂ آسمانی کو دیکھتے رہیں گے۔ جب ملک ہی نہیں رہے گا تو آئین کہاں ہوگا۔ آئین کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کی بندشوں میں جکڑے رہیں اور ہمارا ملک ہماری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہو جائے۔ ملک کا بچانا اولین مسئلہ ہے۔ آئین بنتے بگڑتے رہتے ہیں ملک بار بار نہیں بنا کرتا ایک ہی بار بنتا ہے۔

میں نے ان کے استدلال کے جواب میں کہا اگر ضروری ہو تو یہ قدم بھی اٹھایا جائے گا۔ لیکن فی الحال ایسا کرنا مفید نہ ہوگا۔

## اصغر خاں اور شوکت حیات کی سازش

مارچ کے دوسرے ہفتے شروع ہونے والی سیاسی تحریک اپریل کے اوائل تک اپنے عروج کو جا پہنچی۔ اس موقع پر جنرل ضیاء نے ایک بار پھر زور دیا کہ میں مارشل لاء لگانے کی اجازت دوں۔ لیکن میں مارشل لاء لگوانے کے بجائے بڑے صبر و تحمل سے سیاست دانوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اپریل کے وسط میں اصغر خان کے اشارے پر سردار شوکت حیات نے پنجاب سے تعلق رکھنے والے ممبران قومی اسمبلی سے میرے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرانے کی کوشش کی چونکہ اس سازش کا بر وقت علم ہوگیا تھا۔ اس لیئے میں نے سردار شوکت حیات کو نظر بند کرا دیا۔ سردار شوکت حیات خبطی سا آدمی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں اسے بھارت میں سفیر بنا کر بھیج دوں۔ اس کی لڑکی کی شادی پر اندرا گاندھی نے چوڑیاں بھی بھیجی تھیں اس کے اندرا کے خاندان سے پرانے روابط تھے۔ انہی روابط کو مزید پختہ کرنے کے لیئے وہ سفیر کی حیثیت سے بھارت جانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے اجازت نہیں دی۔

## جزوی مارشل لاءؒ کی اجازت

جن دنوں میں نے شوکت حیات کو نظر بند کیا انہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ فوجی جرنیل اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ اطلاع ... درست تھی تو اس کا مطلب واضح تھا کہ یہ سب کچھ جنرل ضیاء خود ہی کر رہا ہے۔ میں نے جنرل ضیاء کو بلایا۔ اس نے کہا کیا آج ہی آجاؤں میں نے کہا نہیں کل آجا۔ اگلے روز میں نے جب صبح اخبارات دیکھے تو ان میں جنرل ضیاء اور اس کے دوسرے تین جرنیل ساتھیوں کے بیانات تھے۔ ان بیانات میں انہوں نے میری حکومت کی حفاظت کا اعلان کر دیا تھا۔ پچھلے پہر جب جنرل ضیاء میرے پاس آئے تو شکوک و شبہات کا غبار صاف ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے انہیں بتانا مناسب نہ سمجھا کہ انہیں کس غرض کے لیئے بلایا تھا۔ میں نے ان سے حالات کی بابت استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے ذرائع معلومات کے مطابق حالات سول انتظامیہ کے قابو سے باہر ہو چکے ہیں اور میرے جوان اس صورت حال پر بڑے پریشان اور بے صبرے ہو رہے ہیں۔ اگر آپ مارشل لاء کے مکمل نفاذ کے حق میں نہیں تو کم از کم جزوی مارشل لاء پر آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ ان کی یہ تجویز مجھے قدرے معقول نظر آئی جس پر میں نے انہیں جزوی مارشل لاء لگانے کی اجازت دے دی اور چند بڑے شہروں میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

## فوجی ہڑتال فوجی فائرنگ

مارشل لاء لگانے کو تو لگا دیا گیا لیکن یہ قدم اٹھانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ مارشل لاء خود میری حکومت کے خلاف سازش ہے۔ کیونکہ جزوی مارشل لاء کے دوران مجھے برابر یہ حیران کن اطلاعات ملتی رہیں کہ بڑے شہروں کے اہم ... مقامات پر پولیس لوگوں پر تشدد کر کے اشتعال کی آگ کو ہوا دے رہی ہے۔ خود فوجی جوان سفید کپڑوں میں اتحادی شرپسندوں کے ہمراہ سڑکوں پر نعرہ بازی کر رہے ہیں۔ اور فوج کے باوردی جوان نہ صرف ہوائی فائرنگ پر اکتفا کرتے ہیں۔ بلکہ سر عام اپنی بے گناہی کا بھی رونا رو رہے ہیں۔ جس سے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے۔ میں نے اس صورت حال کے پیش نظر صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ احتجاج میں حصہ لینے والے لوگوں سے سختی کے بجائے نرمی کی جائے اور یہ احساس ختم کیا جائے کہ عوام پر بے جا تشدد ہو رہا ہے اور ان لوگوں کے سوا کسی شخص پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے جو توڑ پھوڑ اور آتش زنی جیسے جرائم کے مرتکب ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ملک بھر میں شراب کی بندش کا اعلان کرایا تاکہ جو لوگ مذہب کے نام پر بیوقوف بنائے گئے ہیں۔ ان کے جذبہ اشتعال کو کم کیا جا سکے۔

ان اقدامات کے نتائج کافی حوصلہ افزا تھے، لیکن ۶ مئی کو لاہور کے بھرے بازار انارکلی میں فوجی جوانوں نے نماز جمعہ کے بعد راہگیروں پر فائرنگ کر کے کچھ نوجوانوں کو مار دیا۔ جس سے لوگ مشتعل ہو کر کرفیو کے دوران سڑکوں پر نکل آئے اور اس طرح جزوی مارشل لاء عملاً مفلوج ہو کر رہ گیا۔ میں مارشل لاء اٹھا لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وکلا نے مارشل لاء کے نفاذ کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی اور سپریم کورٹ نے مارشل لاء کو خلاف قانون قرار دیا۔ اب ہمارے لیئے مارشل لاء کو سخت کرنے یا عملی طور پر نافذ کرنے میں صرف آئین ہی نہیں بلکہ سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی رکاوٹ بن گیا۔

## مذاکرات میں مفتی محمود کی ضد

جس روز سپریم کورٹ نے مارشل لاء کے خلاف فیصلہ دیا اس سے ایک دو روز پہلے قومی اتحاد اور حکومت کے نمائندوں کے مابین افہام و تفہیم کے لیئے بات چیت شروع ہو چکی تھی۔ عدالتی فیصلے کے بعد قومی اتحاد کے نمائندے خود اعتمادی سے مذاکرات میں شامل ہوئے اور حکومت نے ٹھنڈے دل سے ان کی باتیں سنیں اور ان پر اپنا موقف واضح کیا۔ لیکن مذاکرات میں ہمارے لیے مشکل یہ تھی کہ قومی اتحاد کے نمائندے کی ایک نکتے پر یکزبان نہیں ہو رہے تھے مثال کے طور پر نواب زادہ نصر اللہ ہر بات کی تان لا کر یہاں توڑتے



تھے کہ جمہوری عمل بلا تاخیر بحال کیا جائے۔ اور اتحاد کے تمام مطالبات غیر مشروط طور پر مان لیے جائیں۔

پروفیسر غفور کا کہنا تھا کہ اتحاد کے امیدوار انتخابات میں کامیاب ہو چکے ہیں اس لیے اقتدار فوری طور پر ہمارے حوالے کیا جائے۔ مفتی محمود فرماتے۔ بحران کا اصل حل اسلامی نظام کا فوری نفاذ ہے۔ . . . . ہم جمہوری عمل کی بحالی کے لیے ناسازگاری حالات کی بات کرتے تو اتحاد کا دوسرا نمائندہ اقتدار کی منتقلی کی بات چھیڑ دیتا اگر ہم انتقال اقتدار کے لیے دوبارہ انتخابات کے نکتے پر آتے اور اس کے لیے شرائط طے کرنے پر زور دیتے تو مفتی محمود اسلامی نظام کے نفاذ کے مسئلے کی طرف آجاتے۔ کئی روز تک ہم مذاکرات میں کسی سمت پیش رفت ہی نہ کر سکے۔

مفتی محمود مولویوں میں نسبتاً معقول آدمی ہیں مگر مذاکرات کے دوران وہ کسی معقولیت کا ثبوت نہ دے سکے اور وہ اسلامی نظام کے نفاذ کے مسئلے پر آخری دم تک بچوں کی طرح ضد کرتے رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ہماری مشکلات پر توجہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔

## نورانی کے لیے ۵ کروڑ روپے

قومی اتحاد میں چونکہ مختلف نقطۂ نظر کی جماعتیں شامل تھیں، اور ہر جماعت کو الگ الگ طور پر ہموار کرنا مشکل تھا لیکن اس کے باوجود ہم نے اس پہلو پر بھی توجہ دی اور کام کیا۔ اتحاد میں شامل چار جماعتیں تحریک استقلال جماعت اسلامی جمعیت علماء اسلام اور این۔ ڈی۔ پی، اپنی انتہا پسندی اور ہٹ دھرمی ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھیں اور مذاکرات میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھیں، مسلم لیگ کی طرف سے بھی مزاحمت کا کوئی خطرہ نہیں تھا، مسلم کانفرنس ان چار جماعتوں کے فیصلے کو بہر حال تسلیم کر لیتی۔ نواب زادہ کی جمہوری پارٹی کی طرف سے انہیں مکمل اختیارات تھے اور نواب زادہ نصر اللہ خاں دل سے چاہتے تھے کہ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر معاملہ طے ہو جائے تاکہ فوجی حکومت کے خطرے کو روکا جا سکے۔ تحریک خاکسار اتنی موثر نہیں تھی کہ وہ تنہا کوئی فیصلہ کر سکتی۔ رہ گئی جمعیت علماء پاکستان تو اس کے نمائندوں کے ممتاز بھٹو سے مذاکرات بہت پہلے شروع ہو چکے تھے۔ ممتاز بھٹو کے ساتھ جمعیت کے حسن حقانی کے مذاکرات ہو رہے تھے اور ان کو نورانی میاں نے اختیار دے دیا تھا کہ وہ حکومت سے معاملہ طے کر کے اتحاد سے علیحدگی کا اعلان کر دیں۔ اس سے قبل رفیق احمد باجوہ نے بھی حکومت سے نورانی میاں کے ایما پر بات چیت کی تھی۔ اس وقت معاملہ اس لیے بگڑ گیا کہ اتحاد کی تمام . . . جماعتوں نے مسٹر باجوہ کو اتحاد کی سیکرٹری شپ سے الگ کرنے پر اتفاق کر لیا تھا اور نورانی میاں نے مجبوراً ہاں کر دی تھی۔

اب جمعیت علماء پاکستان رفیق باجوہ کے مسئلے کو یہ کہہ کر اتحاد سے علیحدگی کا جواز پیدا کرنا چاہتی تھی کہ مسٹر باجوہ کے خلاف جماعت اسلامی نے سازش کی ہے۔ جمعیت کے مولوی حسن حقانی نے حکومت سے مفاہمت کے لیے ۵ کروڑ روپے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اتنی بڑی رقم حکومت کی کسی مد سے یکمشت نہیں دی جا سکتی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جیل میں نورانی میاں سے ملاقات کر کے تبادلہ خیال بھی کیا، لیکن نورانی میاں اس سے کم رقم لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بہر حال ان سے ابھی بات چیت جاری ہی تھی کہ سردار قیوم نے قومی اتحاد کے لیڈروں کو حکومت سے بات چیت کرنے پر آمادہ کر لیا۔

لیکن مذاکرات شروع ہونے کے بعد بھی ان چار جماعتوں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آ سکی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر آپ حضرات نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو ملک مارشل لا کی زد میں آ جائے گا۔ اس پر مفتی محمود نے کہا، مارشل لا سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمارے لیے اب بھی مارشل لا ہے۔ اگر سچ مچ مارشل لا لگ گیا ہمارے حالات جوں کے توں رہیں گے۔ البتہ آپ کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ اگر نقصان ہوگا تو آپ کا ہوگا ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے مفتی محمود نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ مارشل لا سے میری ذات ہی کو نقصان نہیں ملک کو بھی نقصان پہنچے گا۔ جیسا کہ اب حالات نے ثابت بھی کر دیا ہے۔ موجودہ فوجی ٹولے نے ملک کو سیاسی اور معاشی طور پر کھوکھلا کر دیا ہے۔

## مفتی محمود سے خفیہ معاملہ

مذاکرات کے دوران ایک بار مفتی محمود اپنے ساتھیوں سے کچھ دیر پہلے ہی پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ گئے۔ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور جلد ہی انہیں کمرے میں لے گیا تاکہ میں ان کو قائل کر سکوں۔ میں نے ان کی منت کی کہ مجھ سے تعاون کیجیے ورنہ مارشل لا لگ گیا تو ملک برسوں پیچھے

فوجیوں کے تسلط سے نہیں نکل سکے گا میری اور آپ حضرات کی کوششوں سے جو آئین بنا ہے ۔ وہ منسوخ ہو جائے گا ۔ مفتی محمود بجائے اس کے کہ اس موضوع پر مجھ سے بات کرتے انہوں نے الٹا میرے سامنے ہاتھ جوڑ لیے اور کہنے لگے بھٹو صاحب میری طرف سے آپ تاحیات ملک کے وزیراعظم رہیں ، میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کر دیں ۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ خود ان کے دور حکومت میں سرحد میں مکمل اسلام نافذ نہیں ہو سکا ۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم چند گھنٹوں میں ملک کا نقشہ بدل دیں ، ملک کے نقشے سے زیادہ ہمارا اپنا نقشہ خراب تھا ۔ مجھے اپنے گناہ گار ہونے کا اعتراف ہے ۔ لیکن میرے نزدیک خود مفتی محمود بھی اس معیار کے مسلمان نہ تھے ۔ جس معیار کا مسلمان بننے کا وہ مجھ سے تقاضہ کر رہے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی ان کی طرح داڑھی بڑھا لوں ، سر پر بڑا سا رومال باندھ کر ، کھلے کھلے کپڑے پہنوں اور مسجدوں میں جا کر خطبے دیا کروں ، میرے لیے ان کا مطالبہ "کٹ ملا" بننا اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان کے لیے اقتدار کا حصول دشوار تھا ۔ مفتی محمود مجھ سے جو چند باقی مطالبے کرتے تھے ۔ ان کے منوانے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں تھی ۔ دلیل یہی تھی کہ وہ جو کہیں میں وہی مان لوں ، حالانکہ ہر بات کے لیے معقولیت اور ہر مطالبہ کے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسلام کے مکمل طور پر نافذ کرنے کے لیے ماحول نہ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں بھی نہیں بلکہ سعودی عرب میں بھی نہیں ۔ آخر ہم جیتے جاگتے انسان اس ترقی یافتہ دور میں چودہ سو سال پیچھے کے دور میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں ؟

## شورش کاشمیری کا ذکر

مفتی محمود کے بلا دلیل مطالبہ پر مجھے شورش کاشمیری مرحوم یاد آ گئے ۱۹۷۴ء میں انہوں نے بھی مجھ سے چار گھنٹے تک بند کمرے میں ملاقات کی تھی ۔ اس وقت بھی قادیانی مسئلے کی آڑ میں اپوزیشن لیڈروں نے حکومت کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی ، میں اس تحریک سے قطعاً مرعوب نہیں تھا ۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ منبروں کے چند سر پھرے مولوی اور ناکام سیاست دان حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے جہاں تک قادیانیوں کا تعلق ہے ان کی جان و مال کی حفاظت میری حکومت کی ذمہ داری تھی جسکو آخر دم تک نبھایا ۔ ان دنوں شورش کاشمیری میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں قادیانی مسئلہ حل کر دوں ۔ میں نے انہیں واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کی تحریک حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔ البتہ تحریک کے لیڈر حکومت کی مضبوط دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر ضرور پھوڑ دیں گے ۔ حکومت ایسی تحریکوں سے نپٹنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے ۔ . . .

شورش کاشمیری نے میرا دو ٹوک جواب سننے کے باوجود قادیانیوں کے مذہبی معتقدات میرے سامنے رکھے جن کے مطابق امت کا ہر فرد حتیٰ کہ خود میں اور میرے ماں باپ بھی کافر تھے ۔ مجھے قادیانیوں کی کتابیں دیکھ کر بڑا غصہ آیا ۔ کم از کم میں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ قادیانی امام حسنؓ حسینؓ امام علیؓ اور میرے ماں باپ تک کو کافر سمجھتے ہیں ۔ لیکن میں نے اپنے غصے پر قابو پا کر شورش کاشمیری سے کہا یہ تو درست ہے کہ قادیانی امت کے ہر بڑے چھوٹے رکن کو کافر سمجھتے ہیں لیکن ان کے عقائد کے بارے میں ، میں کیا کر سکتا ہوں ، یہ تو علماء کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی تبلیغ کے ذریعے ان عقائد سے تائب کریں اور جو وقت وہ تحریکیں

چلانے صرف کرتے ہیں اسی وقت وہ قادیانیوں کے خلاف تبلیغ میں صرف کریں۔ میری حکومت اس سلسلے میں ان کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہے۔

## قادیانیوں کے سیاسی حربے

شورش کاشمیری نے میرے اس جواب کے بعد مجھ پر قادیانی جماعت کی سیاسی حیثیت واضح کی اور چار گھنٹے کی گفتگو میں انہوں نے ثابت کیا کہ قادیانی پاکستان کے ازلی دشمن ہیں۔ وہ پاکستان میں بیٹھکر اکھنڈ بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کی پیشگوئیاں الہامات پاکستان کے خلاف ہیں وہ ربوے میں اپنے مردے امانت کے طور پر دفن کرتے ہیں۔ انہوں نے ربوے میں ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی ہے۔ جس کی اپنی فوج، اپنی پولیس، اپنا سکرٹریٹ اور اپنی ہی وزارت خارجہ اور داخلہ ہے۔ شورش نے جو کچھ کہا اس پر باحوالہ دلائل دیے اور سب سے آخر میں اس نے بھی مفتی محمود کی طرح ایک جذباتی مطالبہ کیا۔ اس کے مطالبے کو قبول کرنے کے لیئے میرے سامنے اس کے دلائل کا انبار تھا اور میں نے دل ہی دل میں یہ مسئلہ حل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن اسی موقع پر شورش نے ایک ایسی حرکت کی جس سے میں کانپ گیا۔ ان کے ساتھی مولوی تاج محمود جو ان کے ہمراہ تھے وہ بھی بڑے حیران ہوئے۔ شورش نے گفتگو کے دوران بڑے جذباتی انداز میں یکایک اُٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لیئے۔ میں نے شورش کو اسکی عظمت کا احساس دلاتے ہوئے اٹھا کر گلے سے لگایا، مگر شورش لاکر پیچھے ہٹ گیا اور کہنے لگا بھٹو صاحب! ہمارے پاس کونسی عظمت ہے، ہم ایک سو سال سے اپنے آقا و مولی کی عزت و عظمت بحال نہیں کر سکے، ہم سے زیادہ رذیل قوم روئے زمین پر آج تک پیدا ہی نہیں کی ہوگی۔ ہم اس وقت عزت و عظمت کا تاج سر پر رکھ سکتے ہیں جب قادیانیوں سے محمد عربی کی نبوت کا تاج چھین کر آقا کے قدموں میں رکھ کر آقا کو راضی کر لیں، پھر شورش نے روتے ہوئے میرے سامنے... اپنی جھولی پھیلا کر کہا۔

بھٹو صاحب! میں آپ سے اپنے اور آپ کے نبی خاتم المرسلین کی بھیک مانگتا ہوں۔ آپ میری زندگی کی تمام خدمات اور نیکیاں لے لیں۔ میں خدا کے حضور خالی ہاتھ چلا جاؤں گا، مگر خدا کے لیے اپنے نبی کی نبوت کی حفاظت کر دیجیئے! یہ میری جھولی نہیں، فاطمہ بنت محمد کی جھولی ہے۔ یہ خود اس نبی کی جھولی ہے جس کی نبوت پر قادیانی حملہ آور ہیں۔ اب اس سے زیادہ مجھ میں کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ میں بھی آخر مسلمان تھا اور اُسی نبی کا کلمہ پڑھتا تھا۔ اس موقع پر شورش نے بات چیت کا رخ جذباتی رخ کی طرف موڑ دیا تھا اور میں اپنی مسلمان کی حیثیت کے سوا ہر حیثیت بھول گیا تھا۔ میں نے شورش سے وعدہ کر لیا کہ میں قادیانی مسئلہ ضرور بالضرور حل کروں گا۔ پھر میں نے یہ مسئلہ سڑکوں پر نہیں بلکہ قانون کے مطابق پاکستان کی قومی اسمبلی میں حل کر دیا اور قادیانی پاکستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے غیر مسلم قرار پائے۔

## خطابت کا جادو

شورش مجھ سے وعدہ لیکر چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں کئی لمحوں تک سوچتا رہا کہ اس شخص نے شاید مجھ پر جادو کر دیا ہے پھر یکایک مجھے شورش کے استاد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت یاد آگئی۔ ان لوگوں کی خطابت میں واقعی جادو ہے۔ عام آدمی کے جذبات

سے ہر ماہر نفسیات کھیل سکتا ہے، لیکن مجھ جیسے آدمی کو قائل کرنے کے لیے ایک ایسا جذباتی ماحول پیدا کرنا صرف شورش کا کام تھا۔ میں اس شخص کی بہت قدر کرتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد اس نے مرتے دم تک میرے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اس نے جو کچھ کہا اس کے لیے بے پناہ دلائل دیئے ورنہ اس سے پہلے میں قادیانی سنی اختلاف کو مولویوں کی ذاتی جنگ سمجھتا تھا۔

## شاہ فیصل بھی کہہ گئے تھے

عالمی سربراہی کانفرنس کے موقع پر شاہ فیصل بھی مجھے ایسی ہی بات کہہ گئے تھے اسوقت میں نے احتراماً ہاں کر دی تھی لیکن میں حیران تھا کہ شاہ فیصل جیسا مدبر انسان اتنا رجعت پسند اور مذہبی طور پر تنگ نظر کیوں ہے، مگر جب شورش نے یہ حالات میرے سامنے رکھے تو مجھے فیصل مرحوم کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

## نفاذِ اسلام کا مطالبہ ناقابلِ عمل ہے

مفتی محمود نے بھی مذاکرات کے دوران اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں اسی جذباتی رنگ میں مطالبہ کیا تھا، لیکن ان کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ یہ تو کہتے تھے کہ اسلام نافذ کرو۔ لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے کیسے نافذ کروں، میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں اسلام کی خدمت کروں۔ لیکن ایسا کرنا عملاً ممکن نہیں تھا۔ قادیانی مسئلے کے لیے پاکستان میں فضا سازگار اور ماحول خوشگوار تھا اور اس اس کا حل ممکن تھا۔ لیکن اسلام کو اپنی اصلی شکل میں نافذ کرنے کے لیے پاکستان کا ماحول سازگار نہیں ہے۔ میری حکومت کے خاتمے کے بعد مفتی محمود مارشل لاء کے زیر سایۂ اسلام کے جو نعرے لگا رہے ہیں وہ بالکل بے اثر ہیں، کیونکہ اسلام ایک خاص کردار اور سیرت کا طلبگار ہوتا ہے اور جب تک اسلام کا کوئی داعی اسلام کی مطلوبہ سیرت کا حامل نہیں بن جاتا اسلامی نظام نافذ نہیں کر سکتا۔ میں تو خیر گنہگار انسان ہوں، میں اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا نہیں کر سکا۔ کیا جنرل ضیاء نے وہ تبدیلی پیدا کر لی۔ کیا اسلام نے خلیفہ اسلام کے لئے جو معیار پیش کیا ہے، جنرل ضیاء اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ اور کیا خود مفتی محمود ان اوصاف سے متصف ہیں، میں چاہتا تو زبانی طور پر اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کر کے عوام کے دل جیت سکتا تھا۔ لیکن میں اسطرح خدا کے ساتھ منافقت کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا پاکستان میں اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لیے جس ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔

## اتحاد کے نمائندے دب گئے تھے

مگر قومی اتحاد کے نمائندوں کے ان عجیب وغریب مطالبات کے باوجود مذاکرات میں ہم نے مثبت پیش رفت کی۔ کوثر نیازی نے مفتی محمود کو نرم روی پر آمادہ کر لیا تھا۔ پیرزادہ کے مقابلے میں پروفیسر غفور کا غصہ ختم ہو گیا تھا وہ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر معاملہ ختم کرنے پر آمادہ تھے، لیکن اس نازک مرحلے پر ہم ایک بار پھر سازش کا شکار ہو گئے، جب ہم تمام نکات پر متفق ہو گئے اور صرف تحریری معاہدہ باقی رہ گیا تو قومی اتحاد نے ایک نئی شرط پیش کر دی اور یہ شرط اصغر خان کے دباؤ کے تحت پیش کی گئی تھی ادھر مجھے مسٹر رفیع رضا مجبور کر رہے تھے کہ میں کوئی نئی شرط نہ مانوں۔ اس سلسلے میں میں نے پارٹی ممبران سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگے ہم پہلے ہی اتحاد کی ضرورت سے زیادہ شرائط مان چکے ہیں۔ اب اگر ایک اور شرط مان لی تو یہ لوگ کسی اور شرط کا بھی اضافہ کر دیں گے۔ یہ دراصل معاہدہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔

## جانشین کھر کی واپسی

میں ذاتی طور پر بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ قومی اتحاد کی ٹیم معاہدہ سے اجتناب کر رہی ہے انہیں غالباً فوج کی طرف سے کوئی اشارہ مل گیا تھا۔ اس لیے ان کے رویے میں سختی آگئی تھی۔ وجہ کچھ بھی جب ان سے معاہدہ قرار نہ پایا تو میں نے نئے خطوط پر سوچا۔ بہر حال نئے خطوط پر سوچا ایک فطری سی بات تھی، امن کا راستہ انہوں نے ترک کر دیا تھا۔ اب وہ جو نیا کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔ اس کے لیئے مجھے کھر کی ضرورت تھی۔ اب باہر دلیسے بھی ان کی ضرورت ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ مسلم لیگ نے اسے نکال دیا تھا اور کوئی دوسری جماعت اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی چنانچہ ہم نے کھر کو واپس بلا لیا۔ جب تک کھر مسلم لیگ میں رہے قومی اتحاد کی جملہ سرگرمیاں ہمارے علم میں رہیں۔ اب جب کہ ان کو مسلم لیگ نے خارج کر دیا تھا وہ ہمارے لیے پارٹی کے اندر ہی مفید ثابت ہو سکتے تھے مسٹر کھر ایک جذباتی نوجوان ہے۔ اس نے پارٹی میں واپس آکر جو کچھ کیا وہ درست تھا یا غلط؟ اس کی نیت بہر حال درست تھی

## رفیع رضا اور کوثر نیازی بھی امریکی ایجنٹ!

لیکن مسٹر رفیع رضا کے بارے میں مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ اس موقع پر امریکی سی۔ آئی۔ اے کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ مذاکرات کامیاب نہ ہوں اور فوج اقتدار پر قبضہ کر لے اسی طرح کوثر نیازی کے بارے میں بھی میرا غالب گمان تھا کہ وہ ملٹری انٹیلی جینس سے ملا ہوا ہے۔

## ۵ جولائی کا مارشل لاء

جب ہمارے مذاکرات اپنے منطقی نتائج تک پہنچنے سے پہلے ہی سبوتاژ ہو گئے تو جنرل ضیاء نے ایک بار پھر مجھ سے مارشل لاء نافذ کرنے کی اجازت چاہی میں نے پہلے کی طرح اس بار بھی انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن ٹکا خان شاید حالات خراب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ کہنے لگے مارشل لاء ہماری لیے آخری چارہ کار ہے، ہمیں اپنا ملک بچانا ہے۔ اور اس کے لیئے اگر دو چار لاکھ آدمیوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ تو یہ سودا زیادہ مہنگا نہیں اور ویسے بھی مارشل لاء ہم خود لگا رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں ڈر کس بات کا ہے۔ ٹکا خان کی یہی بات جنرل ضیاء نے اپنی تقریروں اور انٹرویوز میں ریپیٹ کی ہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر یہ کوئی سازش تھی وہ خود بھی اس سازش میں شریک تھے۔ الغرض جنرل ضیاء اور ٹکا خان دونوں مارشل لاء لگانے کے مسئلے پر ہم خیال تھے۔ البتہ ان دونوں کے برعکس مسٹر کھر کا یہ کہنا تھا کہ مجھے پارٹی ورکروں کی ضرورت ہے۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر تحریک کو کچل دوں گا۔ بہر حال جب اکثریت نے مارشل لاء کے حق میں فیصلہ دیا تو میں نے جنرل ضیاء کو مارشل لاء لگانے کی اجازت دے دی۔ تاہم میری چھٹی حس کہہ

رہی تھی کہ اس معاملے کی تہہ میں ضرور کوئی گڑبڑ موجود ہے۔

جنرل ضیاء پہلے ہی مارشل لاء لگانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ان کے انتظامات مکمل تھے۔ جوانوں کو صرف آخری حکم دینا باقی تھا۔

## ٹکا خان نے بات بگاڑی

مارشل لاء کی تاریخ طے پا گئی تو ٹکا خان اور رفیع رضا دونوں میرے پاس آئے اور کہنے لگے اگر مارشل لاء لگانا ہی ہے۔ تو اس کے لیے جنرل ضیاء قطعاً غیر موزوں آدمی ہے۔ یہ شخص مٹی کا بت اور احکامات کا بندہ ہے۔ عمل اور صورت فیصلہ کی اس میں کوئی صلاحیت نہیں۔ اسے "یس سر، یس سر" کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ اس کام کے لیے کوئی دلیر اور دلبند آدمی ہونا چاہیے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہارے خیال میں اس کام کے لیے کون مناسب رہے گا۔ انہوں نے جنرل عارف کا نام لیا۔ ٹکا خان کچھ بھی ہو وہ آدمی بڑا دلیر ہے اور فوجی نقطہ نظر سے اس کی رائے ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ اس کا فارمولہ مان لیا۔ لیکن اس فارمولے پر عمل درآمد کے لیے وقت بہت کم تھا۔ مارشل لاء کے نفاذ میں صرف تین روز باقی تھے اور اس سے پہلے جنرل ضیاء سے چارج لینا ضروری تھا اس سے پہلے کہ ہم اس منصوبے پر عمل درآمد کرتے کوثر نیازی نے جنرل ضیاء کو آگاہ کر دیا اور جنرل ضیاء محتاط ہو گئے۔ ٹکا خان نے دراصل بہت ہی غلط رائے دی تھی۔ اب ہمارے ہاتھ سے ایک ایسا آدمی نکل گیا تھا جس کے پاس طاقت اور فورس تھی اور اس موقع پر ہم صرف عقل سے کام لے کر اسے ہموار کر سکتے تھے۔ لیکن اسے بدقسمتی ہی کہیے کہ جس روز رات کے وقت میں نے جنرل ضیاء سے اس بارے میں بات کرنی تھی اس روز اسی وقت امریکی سفیر بغیر کسی پیشگی اطلاع کے میرے پاس آ گیا۔ شاید وہ مجھے کچھ لمحات تک مصروفیات رکھنا چاہتا تھا۔ عین اس وقت جب امریکی سفیر مجھ سے ملاقات کر رہا تھا جنرل ضیاء اسی طرف اپنے انقلابی پروگرام کے نقشے پر آخری نظر ڈال رہے تھے۔ مارشل لاء کے نفاذ کا وقت ۵ اور ۶ جولائی کی درمیانی شب تھا اور ہم نے اس سے پہلے جنرل ضیاء سے چارج بہر حال لینا تھا مگر جنرل ضیاء نے اس بارے میں ہشیاری یہ کی کہ مقررہ وقت سے ایک روز پہلے ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب ہی نقارے پر چوٹ لگا دی۔ اس صورت حال کا مجھے اسوقت علم ہوا جب میں ٹکا خان کے نامزد جنرل کو ٹیلیفون پر نئی ہدایات دینے کے لیے ڈائل گھمانے لگا۔ اسی لمحے میرا ملٹری ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مجھے اطلاع دی کہ پرائم منسٹر ہاؤس اس وقت فوجی جوانوں کے گھیرے میں ہے۔ میں نے جنرل ضیاء کو فون کیا تو انہوں نے مارشل لاء کے نفاذ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا:

"سر یہ سب کچھ آپ کے حکم پر ہوا ہے۔ البتہ پرائم منسٹر ہاؤس کو فوج نے میرے حکم سے گھیرے میں لیا ہے کیونکہ ایسا کرنا ضروری تھا اور آپ اپنے کو مسلح افواج کی تحویل میں سمجھیں۔"

کوئی وجہ نہ تھی کہ میں ان کی بات نہ سمجھتا۔ میں جان گیا کہ رفیع رضا اور کوثر نیازی ڈبل گیم کھیلتے رہے ہیں۔ میں نے جنرل ضیاء سے پوچھا میں کپڑے وغیرہ پہن کر تیار ہو جاؤں۔ اس نے کہا "نہیں سر آج رات آپ یہیں آرام فرمائیں کل ہم آپ کو مری لے چلیں گے۔" جنرل ضیاء کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس نے شاید پہلے ہی سے میرے بارے میں یہ فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس نے سب سے پہلے جزوی مارشل لاء کی اجازت اس لیے مانگی تھی تاکہ مکمل مارشل لاء کا جواز پیدا کیا جا سکے اور اس دوران وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اعتماد میں لے سکے۔ پھر دوسری بار اس نے یہ اجازت اس لیے ضروری سمجھی تھی تاکہ حکومت کی دوسری فورسز کی طرف سے اسے متوقع مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جنرل ضیاء نے اپنے اس اقدام کے جواز میں کہا کہ انہوں نے ملک سے ایک ظالم اور جابر حکومت کے خاتمے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ حالانکہ وہ اس ظالم اور جابر حکومت کی حفاظت کے سلسلے میں بیان بھی دے چکے تھے۔ اور اصل صورت حال یہ تھی کہ مارشل لاء انہوں نے میرے مشورے اور اجازت سے میری قانونی حکومت کی حفاظت کے لیے لگایا تھا مگر انہیں اختیارات گھوڑا ملا تو وہ خود مجھے کچلنے سے باز نہ رہ سکے۔ مری میں انہوں نے مجھے پیشکش کی کہ میں اس سے سودے بازی کر لوں مگر میں نے اس کی پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں ایک عوامی نمائندہ ہوں۔ میں دوبارہ انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آ جاؤں گا۔ جنرل نے کہا اب آپ اقتدار کو بھول جائیں۔ آپ میرے مضبوط ہاتھوں کے ایسے شکنجے میں آ چکے ہیں جن سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ جنرل کو جب ٹکا خان کے احمقانہ مشورے کے بعد اپنی نوکری خطرے میں نظر آئی۔ تو اس نے ہمیں جل دیکر ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔ ایک طرف تو اس نے قومی اتحاد کو خوش کر کے اس کی تحریک کا دم توڑ دیا اور دوسری طرف میری قانونی حکومت ختم کر کے بلا شرکت غیرے اقتدار پر قابض ہو گیا۔

میں نے مری میں جنرل ضیاء کی دھمکی کے جواب میں اسے ڈانٹ کر کہا تھا کہ میں کسی جنرل سے ہرگز نہیں ڈرتا۔ لیکن اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ جنرل ضیاء میرے خلاف ایک جھوٹا فوجداری مقدمہ قائم کر دے گا۔

(افسوس کہ اس کہانی کے راوی شریف بلا کو بھی ۱ اپریل کو کوٹ لکھپت جیل میں پھانسی دے دی گئی)

نعیم جواد

## یہی اعداد و شمار

# ہر حکمران کا زوال بنے!

| | جولائی ۱۹۷۱ء | بھٹو کے پہلے بجٹ کے بعد جولائی ۷۲ء | جولائی ۱۹۷۵ء | جون جولائی ۱۹۷۷ء | اپریل ۱۹۷۸ء |
|---|---|---|---|---|---|
| آٹا گندم فی سیر | ۰٫۶۶ | ۰٫۷۶ پیسے | ۱٫۶۲ | ۱٫۷۵ روپے | ۲٫۰۰ روپے |
| چاول باسمتی قسم اول فی سیر | ۱٫۳۱ | ۱٫۷۸ | ۴٫۰۸ | ۵٫۰۰ | ۶٫۵۰ |
| چاول ٹوٹا ہوا فی سیر | ۰٫۶۳ | ۱٫۷۵ | ۱٫۸۷ | ۳٫۲۵ | ۳٫۵۰ |
| دال مسور ٹوٹی ہوئی 〃 | ۱٫۴۶ | ۱٫۷۵ | ۲٫۵۵ | ۴٫۳۵ | ۵٫۵۰ |
| دال مونگ دھلی ہوئی 〃 | ۱٫۵۷ | ۱٫۷۴ | ۳٫۱۸ | ۵٫۵۰ | ۵٫۵۰ |
| دال ماش 〃 〃 | ۱٫۸۴ | ۱٫۹۲ | ۴٫۸۰ | ۵٫۵۰ | ۷٫۵۰ |
| دال چنا 〃 〃 | ۰٫۸۰ | ۱٫۰۰ | ۲٫۲۲ | ۲٫۵۰ | ۳٫۵۰ |
| گوشت بکرا عمدہ قسم | ۶٫۶۹ | ۷٫۰۰ | ۱۳٫۰۰ | ۱۶٫۰۰ | ۱۸٫۰۰ |
| گوشت گائے 〃 〃 | ۲٫۵۰ | ۳٫۱۳ | ۷٫۰۰ | ۷٫۷۵ | ۹٫۰۰ |
| مچھلی رہو 〃 〃 | ۳٫۸۸ | ۲٫۷۹ | ۷٫۸۰ | ۹٫۰۰ | ۹٫۰۰ |
| دودھ گائے کچا 〃 〃 | ۱٫۳۷ | ۱٫۵۰ | ۳٫۰۰ | ۳٫۷۶ | ۴٫۵۰ |
| گھی پنجاب 〃 〃 | ۱۰٫۰۰ | ۹٫۶۵ | ۱۹٫۳۳ | ۲۱٫۶۵ | ۲۴٫۰۰ |
| دہی 〃 〃 | ۱٫۷۵ | ۲٫۰۰ | ۴٫۶۰ | ۶٫۰۰ | ۶٫۰۰ |
| بناسپتی گھی ڈالڈا ۵ پونڈ | ۱۲٫۶۶ | ۱۲٫۵۰ | ۲۳٫۵۰ | ۲۲٫۵۰ | ۲۳٫۵۰ |
| 〃 〃 مالٹا 〃 | ۱۲٫۲۶ | ۱۱٫۸۵ | ۹٫۰۰ روپیہ | ۹٫۶۵ روپے کلو | ۹٫۶۵ |
| سرسوں کا تیل (کولہو اعلیٰ) فی سیر | ۳٫۶۲ | ۳٫۵۸ | - | - | - |
| 〃 〃 (مل) 〃 〃 | ۳٫۴۷ | ۳٫۳۷ | - | - | - |
| 〃 〃 (درمیانہ) 〃 〃 | ۳٫۲۰ | ۲٫۷۵ | ۷٫۴۰ | ۶٫۲ روپے | ۸٫۵۰ |
| آلو (اوسط معیار) 〃 〃 | ۰٫۵۳ | ۰٫۹۲ | ۱٫۲۵ | ۲٫۵۰ | ۲٫۵۰ |
| پیاز 〃 〃 〃 〃 | ۰٫۷۴ | ۰٫۳۳ | ۱٫۷۰ | ۳٫۵۰ | ۰٫۶۰ |
| کدو 〃 〃 〃 〃 | ۰٫۶۴ | ۰٫۶۴ | ۱٫۳۵ | ۱٫۵۰ | ۱٫۵۰ |
| بینگن 〃 〃 〃 〃 | ۰٫۵۹ | ۰٫۸۴ | ۱٫۶۶ | ۳٫۲۵ | ۳٫۰۰ |
| ٹماٹر 〃 〃 〃 〃 | ۰٫۶۹ | ۱٫۴۱ | ۲٫۳۵ | ۳٫۰۰ | ۴٫۰۰ |
| کریلا 〃 〃 〃 〃 | ۱٫۷۰ | ۱٫۴۱ | - | ۳٫۵۰ | ۴٫۰۰ |
| ادرک فی سیر | - | ۷٫۲۵ | ۱۴٫۷۵ | ۲۱٫۸۰ | ۱۶٫۰۰ |
| چینی (صاف) کھلا بھاؤ فی سیر | ۱٫۶۷ | ۲٫۹۷ | ۷٫۰۰ | ۷٫۰۰ | ۶٫۵۰ |
| 〃 〃 راشن | ۱٫۷۵ | ۱٫۶۰ | ۴٫۰۰ روپیہ | ۴٫۳۰ | ۴٫۳۰ |
| گڑ فی سیر | ۰٫۷۵ | ۱٫۶۳ | ۳٫۰۰ | ۲٫۵۰ | ۳٫۲۵ |
| پہاڑی نمک فی سیر | ۰٫۳۵ | ۰٫۳۷ | ۰٫۶۰ | ۱٫۲۵ | ۱٫۲۵ |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ثابت لال مرچ 〃 〃 | ۳٫۰۰ | ۳٫۹۹ | - | ۱۲٫۲۰ | ۱۲٫۵۰ |
| لال مرچ پسی ہوئی فی سیر | ۳٫۶۰ | ۴٫۸۵ | - | ۱۴٫۰۰ | ۱۴٫۰۰ |
| ہلدی ثابت فی سیر | ۷٫۶۹ | ۸٫۰۷ | - | ۳۳٫۰۰ | ۳۸٫۰۰ |
| 〃 پسی ہوئی 〃 | ۸٫۹۸ | ۹٫۲۸ | - | ۴۰٫۰۰ | ۴۸٫۰۰ |
| لکڑی جلانے کی کیکر فی من | ۵٫۰۰ | ۴٫۹۱ | ۱۳٫۰۰ | ۱۶٫۶۵ | ۱۴٫۰۰ |
| کوئلہ کیکر فی من | ۱۵٫۰۰ | ۱۵٫۷۲ | ۲۹٫۵۰ | ۳۸٫۰۰ | ۴۰٫۰۰ |
| مٹی کا تیل فی پنٹ (بوتل) | ۰٫۲۵ | ۰٫۳۳ | ۰٫۵۶ | ۰٫۵۵ | ۰٫۵۵ |
| ماچس ۵۰۔۴۰ دیاسلائی کی ڈبیا | ۰٫۰۸ | ۰٫۱۵ | ۰٫۱۵ | ۰٫۲۵ | ۰٫۲۰ |
| لٹھا کالونی ... ۱۵ فی گز | ۲٫۶۶ | ۲٫۸۳ | ۵٫۰۰ | ۶٫۰۰ | ۶٫۵۰ |
| پاپلین فی گز | ۳٫۶۰ | ۳٫۵۹ | ۶٫۲۱ | ۹٫۷۵ | ۹٫۰۰ |
| ڈرل خاکی فی گز | ۳٫۰۰ | ۳٫۰۲ | ۵٫۸۳ | ۷٫۲۸ | ۷٫۵۰ |
| صابن دھلائی کا اعلیٰ ۱۲ اونز | ۰٫۹۰ | ۱٫۱۴ | - | - | - |
| صابن دھلائی کا اوسط ½ پونڈ | - | ۰٫۶۱ | ۱٫۱۲ | ۱٫۴۰ | ۱٫۵۰ |
| دھونے کا سوڈا آئی سی آئی فی سیر | ۱٫۰۰ | ۱٫۳۴ | - | - | - |
| ڈبل روٹی توس والی ایک پونڈ | ۰٫۶۵ | ۰٫۶۵ | ۱٫۵۰ | ۱٫۷۵ | ۱٫۷۵ |
| مکھن دو اونس | ۰٫۵۶ | ۰٫۵۶ | ۱٫۲۵ | ۱٫۵۰ | ۱٫۷۵ |
| بسکٹ سالٹش (اے بی) | ۴٫۵۰ | - | ۱۰٫۹۰ | ۱۴٫۰۰ | - |
| بچوں کا دودھ کاؤ گیٹ ۱ پونڈ | ۷٫۰۰ | ۱۰٫۰۰ | ۱۴٫۰۰ | - | ۱۶٫۰۰ |
| 〃 〃 گلیکسو 〃 | ۶٫۹۲ | ۶٫۹۵ | ۸٫۵۰ | ۱۰٫۵۰ | - |
| 〃 〃 آسٹر 〃 〃 | ۶٫۹۲ | ۶٫۹۵ | ۸٫۵۰ | ۹٫۷۵ | ۹٫۷۵ |
| ٹوائلٹ سوپ (رکسونا) ۳٫۳ | - | ۱٫۲۵ روپے | ۲٫۰۰ | ۲٫۲۵ | ۲٫۴۰ |
| 〃 〃 (لکس) ۳٫۳ | - | ۱٫۲۵ | ۲٫۰۰ | ۲٫۲۵ | ۲٫۴۰ |
| الیکٹرک بلب (۶۰ واٹ) | ۱٫۷۵ | ۱٫۷۵ | ۳٫۲۵ | ۳٫۵۰ | ۵٫۰۰ |
| شیونگ اسٹک (رسمک) | ۲٫۳۰ | ۲٫۳۲ | ۵٫۱۰ | ۵٫۲۵ | ۵٫۰۰ |
| بالوں کا تیل (املا، چنبیلی) فی بوتل | ۲٫۵۰ | ۲٫۵۰ | ۴٫۰۰ | ۵٫۰۰ | ۵٫۰۰ |
| ٹوتھ پیسٹ فارہنز چھوٹی عدد | ۳٫۴۰ | ۳٫۴۰ | ۶٫۰۰ | ۹٫۲۵ | ۱۲٫۰۰ |
| 〃 〃 تبت 〃 | ۱٫۸۷ | ۲٫۰۴ | ۲٫۷۵ | ۵٫۲۵ | - |
| ٹوتھ برش (ٹیک) 〃 | ۲٫۲۴ | ۲٫۴۶ | ۵٫۱۹ | ۵٫۲۵ | ۵٫۰۰ |
| بلیڈ ٹریٹ ۱۰ عدد | ۱٫۲۰ | ۱٫۲۰ | ۱٫۷۵ | ۲٫۵۰ | |
| سیون اوکلاک ۵ عدد | ۱٫۰۱ | ۱٫۳۲ | ۲٫۲۰ | ۳٫۰۰ | |

یہ نرخ کلو گرام میں ہیں!

# پریس

# اینڈ پبلیکیشنز

# آرڈی نینس

تلخیص:
تنویر احمد



پاکستان میں بڑے بڑے شیر مر گئے مگر پریس آرڈی نینس کا یہ کاغذی شیر غلامی کے دور سے آزادی کے عہد تک زندہ رہا۔ اس کی مرغوب غذا ہے اخبار نویسوں کا تازہ خون!

**ایوب خان** کی آمریت کے خلاف ابھرنے والی عوامی تحریک کے مطالبات میں

پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۳ء کو منسوخ کرنے کا مطالبہ سرفہرست تھا۔ کیونکہ یہ قانون اخبارات کی آزادی کے ان بلند بانگ دعووں کے یکسر خلاف تھا جو حکومت کی طرف سے اکثر بیشتر سامنے آتے رہتے۔ ایوب خان کی حکومت کے خاتمے کے بعد فوجی حکمرانوں کا دور آیا تو اس وقت بھی یہ قانون جوں کا توں رہا۔ تاہم کچھ عرصے تک اخبارات و رسائل کے ڈیکلریشن کے حصول کا مسئلہ وقتی طور پر آسان ہو گیا۔

لیکن آسانی سے فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکے جن کے پاس موٹی سفارشیں موجود تھیں۔ کیونکہ ڈیکلریشن کے حصول کا طریق کار وہی تھا جو ایوب خان کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اس میں یہ نرمی کر دی گئی تھی کہ جان پہچان پیسہ اور تعلقات رکھنے والے لوگوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر عوامی دور آیا تو ان لوگوں کے وارے نیارے ہو گئے جو سرکار کے وفادار تھے۔

وفاداری کا وہ مفہوم جسے عام لوگ سمجھتے ہیں۔ ان دنوں متروکات سخن میں شمار ہونے لگا اور ان لوگوں کی وفاداری پر اعتماد کیا گیا جو جدی پشتی ٹوڈی تھے اور حکمرانوں کے حضور ان انداز ٹوڈیت ایسا ہوتا تھا کہ ان پر بیخ زنی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

بھٹو نے عوامی تحریک کے دوران پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس ختم کرنے کا اعلان کیا، لیکن یہ اعلان اعلان ہی رہا۔ عملاً اس پر عمل درآمد کی نوبت نہ آئی۔ متعلقہ حلقوں سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو وہ صاف طور پر مکر گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت کی طرف سے انہیں تحریری احکامات نہیں دیئے گئے۔ اس لیے محض اعلان کی کوئی حیثیت نہیں۔

۵ رجولائی کو ملک کی قیادت ایک بار پھر مسلح افواج کے ہاتھ میں آگئی۔ عبوری حکومت نے بھی ڈیکلریشن کے حصول کے طریق کار کو آسان بنانے کا اعلان کیا۔ بعض لوگوں کو نئے ڈیکلریشن بھی دیئے گئے۔ ہمارے ایک انتہائی قابل احترام اخبار نویس دوست نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی پریس کانفرنس کے دوران اس بارے میں سوال اٹھایا تو انہیں کہا گیا: "کون کہتا ہے ڈیکلریشن نہیں ملتے آپ ایک چھوڑ دو ڈیکلریشن لے لیں"۔ اور پھر واقعتاً انہیں ہفتہ وار اور ماہنامہ رسائل کے دو ڈیکلریشن مل گئے لیکن بات شخصیت کی نہیں ضابطے کی ہے جو بحالہٖ موجود ہے۔

یہ آرڈیننس جو ایوب خان کو کسی سیاسی قصاب نے بنا کر دیا اور اس نے اسے اخبار نویسوں پر مسلط

کر دیا۔ اس کے خلاف صرف اخبار نویس ہی نہیں سیاست دان اور ملک کے دوسرے تمام طبقات وقتاً فوقتاً صدائے احتجاج بلند کرتے رہے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اب جب کہ ایسے حکمران برسرِ اقتدار ہیں جنہوں نے عوام پر اپنے دروازے کھولنے کا اعلان کیا ہے۔ ہم ان کے دل کے دروازوں پر ہلکی سی دستک دینے کے لیے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس اور اس کا پس منظر [illegible] کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ جمہوری حکومت اس غیر جمہوری مسئلے کا بھی حل کر دے۔

مروجہ پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈی ننس کے تحت کوئی شخص بغیر ڈیکلریشن حاصل کیے نہ چھاپہ خانہ قائم کر سکتا ہے نہ اخبار جاری کر سکتا ہے۔ ہم اس پابندی کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اسے جائز تسلیم کیے جاتے ہیں، حالانکہ لفظ ڈیکلریشن کے معنی ہیں اعلان۔ ڈیکلریشن دیے جانے کا تصور ہی غلط ہے۔

چھاپہ خانہ صنعت میں شامل کیجیے یا کاروبار میں اس کے لیے اجازت نامے کی کڑی شرائط کیوں ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض صنعتی اور کاروباری اداروں کے لیے اجازت نامے کی کڑی شرائط رکھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بارود خانہ، شراب خانہ، افیون کا ٹھیکہ، سینما وغیرہ۔ ان میں بعض کاروبار "خطرناک" سمجھے جاتے ہیں اور بعض اخلاقی اقدار کے منافی چھاپہ خانہ کس زمرے میں آتا ہے؟ شاید دونوں میں۔

## ایسٹ انڈیا کمپنی کے قوانین

چھاپہ خانوں پر پابندیاں اس برِعظیم کے دورِ غلامی کی یادگار ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں جن اداروں کو اپنے مفادات کے منافی سمجھتی تھی ان میں چھاپہ خانہ بھی تھا کیوں کہ اس میں ایسی کتابوں، ایسے رسائل اور اخبارات کے چھپنے کا اندیشہ تھا جن میں کمپنی بہادر کے خلاف "آزادی کے جرم" کی ترغیب دی جائے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل میں ہی ایک قانون نافذ کیا گیا جس کے تحت کوئی فرد لائسنس حاصل کیے بغیر نہ چھاپہ خانہ قائم کر سکتا تھا نہ استعمال کر سکتا تھا۔ ۱۹۶۰ء تک یہ پابندی برطانوی مفاملت کے مطابق کبھی نرم اور کبھی سخت ہوتی رہی اور ۱۸۶۰ء میں وہ قانون نافذ کیا گیا جو ۱۹۶۰ء تک رائج رہا۔ اس قانون میں چھاپہ خانہ کی ملکیت کے متعلق صرف یہ شق تھی۔

کوئی ایسا شخص ملک میں اپنے قبضے میں چھاپہ خانہ نہیں رکھے گا جس نے اپنے علاقے کے مجسٹریٹ کے روبرو یہ اعلان نامہ داخل کیا ہو کہ "منکہ فلاں اقرار کرتا ہوں کہ میری تحویل میں ایک چھاپہ خانہ ہے جو ... (مقام کی وضاحت) پر واقع ہے۔"

اس ایکٹ میں کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس کے تحت مجسٹریٹ متعلقہ یا حکومت چھاپہ خانہ قائم کرنے یا چلانے کے اقرار نامے کو نامنظور کر دے یا ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دے۔

دورِ غلامی کے اس قانون میں چھاپہ خانہ قائم کرنے اور چلانے کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ البتہ ڈیکلریشن کی شرط کا مقصد یہ تھا کہ حکام کے پاس ہر چھاپہ خانے کا مکمل پتہ موجود رہے، تاکہ اگر کہیں کوئی چھپا ہوا قابلِ اعتراض مواد پایا جائے تو چھاپہ خانہ کی معرفت معلوم کیا جا سکے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے، لیکن غیر ملکی حکمران زیادہ عرصے تک اس فراخدلانہ قانون کے پابند نہیں رہے۔ جب بھی آزادی کی تحریک ابھرتی تھی وہ چھاپہ خانوں پر عارضی پابندیاں لگا دیتے تھے۔ تا آنکہ ۱۹۳۱ء میں پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ نافذ کیا گیا۔ یہ ایکٹ بھی ۱۹۶۰ء تک نافذ رہا اور اس میں چھاپہ خانہ چلانے کے حق پر ضمانت نامے کی پابندی عائد کر دی گئی۔

اس پابندی کا مفہوم یہ تھا۔ (دفعہ ۳۔ ایکٹ ۱۹۳۱ء) کہ چھاپہ خانے کے مالک کے ڈیکلریشن داخل کرنے کے دس دن کے اندر اندر مجسٹریٹ متعلقہ اگر چاہے تو وجوہات تحریر میں لا کر ڈیکلریشن داخل کرنے والے سے ایک ہزار روپیہ بطور ضمانت طلب کر سکتا ہے، اس کے باوجود ڈیکلریشن اقرار نامہ ہی رہا۔ لائسنس نہیں بنا۔ حکام کو یہ اختیار نہیں ملا کہ وہ ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دیں۔ یہ ضرور ہے کہ چھاپے خانے بند کرنے کے لیے حکومت دوسرے خاص قوانین کا سہارا لیتی رہی۔

۱۹۶۰ء میں پاکستان کا پہلا "جامع" قانون پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس نافذ کیا گیا۔ اس میں بھی چھاپہ خانے کی حد تک ڈیکلریشن کی، ۱۸۶۰ء کے تحت کی مذکورہ بالا دفعہ میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا۔

جب بھی چھاپہ خانے کی جائے وقوعہ میں تبدیلی ہو نیا ڈیکلریشن داخل کرنا لازم ہوگا۔ بشرطیکہ یہ تبدیلی ۶۰ دن سے کم مدت کے لیے ہو اور وہ جگہ جہاں چھاپہ خانہ منتقل کی گئی ہو، اسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیار میں ہو جس کے سامنے پہلا اقرار نامہ داخل کیا گیا تھا۔ چھاپہ خانے کا منصرم دائی ہے اور منتقل کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس تبدیلی کی اطلاع ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دے دی جائے۔

یہ قانون ہماری تاریخ کے کالے قوانین میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں چھاپہ خانہ بند کرنے کے وسیع اختیارات انتظامیہ کو دے دیے گئے تھے، لیکن چھاپہ خانے کا ڈیکلریشن نامنظور کرنے کا اختیار ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو نہیں تھا اور ۱۹۳۱ء کے ایکٹ کی وہ شق جس کے تحت چھاپہ خانے کے مالک کو ڈیکلریشن کے ساتھ زرِ ضمانت جمع کرانے کا حکم دیا جا سکتا تھا وہ بھی قانون میں شامل نہیں تھی۔

۱۹۶۲ء کے نفاذ کے بعد چھاپہ خانے اور اخبارات کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صوبائی حکومت کو دے دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء کے قانون میں پہلی ترمیم ایک آرڈی ننس کے ذریعے ستمبر ۱۹۶۳ء میں کی گئی۔ ایک مہینے کے بعد یعنی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو مغربی پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس جاری کیا گیا جو آج تک نافذ ہے۔ اس میں بھی چھاپہ خانے کے ڈیکلریشن حاصل کرنے کی شرط جوں کی توں قائم رہی۔

۱۹۶۶ء میں اس قانون میں انتہائی قابلِ اعتراض شرائط کا اضافہ کیا گیا۔ مغربی پاکستان کے آرڈی ننس نمبر ۲ مجریہ ۱۹۶۶ء کے تحت پہلی مرتبہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ،

چھاپہ خانے کے لیے ڈیکلریشن داخل کرنا کافی نہیں، بلکہ اس کی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے تصدیق ضروری ہے۔ گویا اقرار نامہ اجازت نامے میں تبدیل ہو گیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اختیار دیا گیا کہ وہ ڈیکلریشن پر ہرگز دستخط نہیں کرے گا۔ جب تک اس امر کا اطمینان نہ کر لے کہ:

الف:۔ مجوزہ نام کا پریس صوبے میں پہلے سے قائم نہیں۔

ب:۔ ڈیکلریشن داخل کرنے والے کو گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں اخلاقی جرم کی سزا نہیں بھگتنا پڑی۔

ج:۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کسی ایسے پریس کے ڈیکلریشن کی تصدیق ہرگز نہیں کرے گا جس کے بارے میں حکومت کو یقین ہو، ایسی اطلاع کی بنیاد پر اس کے قبضے میں ہو، اس کا عمل پاکستان کے دفاع یا خارجہ تعلقات یا تحفظ کے منافی ہوگا یا وہ چھاپہ خانہ قابلِ دست اندازی، تشدد آمیز جرم

کی ترغیب یا رسوا کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔ البتہ ڈیکلریشن نامنظور کرنے سے پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شخص متعلقہ کو اپنی صفائی اور شہادت پیش کرنے کا موقع دے گا اور ایسے حکم کے خلاف شخص متعلقہ حکومتِ مغربی پاکستان کے پاس فریاد کر سکے گا اور حکومت چاہے تو اس حکم میں تبدیلی کر دے یا اس کی توثیق کر دے یا اسے منسوخ کر دے، لیکن ایسا کرتے ہوئے حکومت کسی ضابطے کی پابند نہیں۔

اس طرح اب چھاپہ خانے کے لیے ڈیکلریشن داخل کرنا کافی نہیں، بلکہ مالک کو ڈیکلریشن حاصل کرنا پڑتا ہے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چاہے تو اجازت نامہ برسوں تک نہ دے، وہ کسی میعاد کا پابند نہیں۔ چنانچہ ایوب خاں کے دور میں اس کامل اختیار کے استعمال کی حیرت انگیز مثالیں سامنے آئیں۔

مثال کے طور پر زید چھاپہ خانہ قائم کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے چھاپہ خانہ خریدے اور قیمت خرید کی رسید ڈیکلریشن کے ساتھ داخل کرے۔ پھر چھاپہ خانہ خرید لیا گیا اور مدت تک استعمال نہیں ہو سکا، کیونکہ اجازت نامہ نہیں ملا۔

اگر چھاپہ خانہ کا مالک مرجائے تو اس کے ورثا تو فی کی جائداد کے حقدار ہوں گے حق دار لیکن چھاپہ خانے کے ڈیکلریشن کے لازمی طور پر مستحق نہیں۔ وہ ڈیکلریشن داخل کریں۔ اگر اجازت مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ چھٹی۔

کیا اس قسم کی پابندیاں کسی مہذب اور بنیادی حقوق کا احترام کرنے والی سوسائٹی میں جائز قرار دی جا سکتی ہیں؟

## اخبار کا ڈیکلریشن

اخبار شائع کرنے کے لیے ڈیکلریشن کی پابندیاں اور بھی سخت ہیں۔

۱۸۶۷ء کے ایکٹ ا پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ میں اخبارات کے ڈیکلریشن کے متعلق یہ دفعات تھیں:

درج ذیل قواعد پورے کیے بغیر کوئی اخبار شائع نہیں کیا جائے گا۔

الف: اخبار کی ہر کاپی پر ایڈیٹر کا نام بطور ایڈیٹر صاف نہ چھاپہ جائے۔

ب: اخبار کا ناشر (پرنٹر) اور ناشر (پبلشر) اپنے متعلقہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے روبرو اصالتاً یا وکالتاً پیش ہو کر ایک ڈیکلریشن داخل کرے جس میں وہ اقرار کرے کہ وہ اخبار ــــــ نامی کا پرنٹر دیا پبلشر یا پرنٹر اور پبلشر) ہے اور یہ اخبار (فلاں جگہ) سے چھاپا یا شائع یا چھاپہ اور شائع کیا جاتا ہے۔

ج: جب بھی مقام طباعت یا اشاعت میں تبدیلی ہو نیا ڈیکلریشن لازمی ہو گا۔

د: جب بھی پرنٹر یا پبلشر ملک سے باہر جائے گا کسی نئے پرنٹر یا پبلشر کا ڈیکلریشن ضروری ہو گا۔

ہ: البتہ کوئی نابالغ فرد ڈیکلریشن داخل کرنے یا اخبار کی ادارت کرنے کا مجاز نہ ہو گا۔

و: ڈیکلریشن کی دونوں کاپیوں پر مجسٹریٹ متعلقہ اپنے دستخط اور مہر ثبت کر کے ڈیکلریشن کی تصدیق لازمی کرے گا۔ ان میں سے ایک کاپی مجسٹریٹ مذکور کے پاس رہے گی اور دوسری ہائی کورٹ کے پاس ریکارڈ میں۔

اس ایکٹ کی مندرجہ بالا دفعات اور بعد کی دفعات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قانون کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہر اخبار کی اشاعت اور اس میں شامل مواد کا کوئی نہ کوئی شخص ذمہ دار ضرور ہو، تاکہ اگر کوئی اخبار ایسا چھپے یا کسی اخبار میں ایسا مضمون یا خبر چھپ جائے جو ملک کے عام قوانین کے تحت مواخذہ کر سکیں۔ اس ایکٹ میں کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس کی رو سے ڈیکلریشن کی تصدیق سے انکار کیا جائے۔

بالفاظِ دیگر اس قانون کے تحت ہر شخص کو ڈیکلریشن داخل کرنے کا حق حاصل تھا۔ ۱۹۲۱ء کے مذکورہ بالا ایکٹ میں بھی ڈیکلریشن کا حق قائم رہا۔ البتہ برطانوی حکمرانوں نے آزادی کی تحریک سے پریشان ہو کر یہ ترمیم کر دی کہ اخبار کے ڈیکلریشن کے ساتھ ساتھ زرِ ضمانت طلب کی جا سکتی تھی۔ عام طور پر ڈیکلریشن داخل کرنے کے تھوڑے ہی دن بعد تصدیق کی کارروائی ہو جاتی تھی۔ خاص قوانین کے تحت حکومت زرِ ضمانت طلب کر کے یا اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کر کے اخبار کی اشاعت روک سکتی تھی، لیکن اخبار کا ڈیکلریشن نامنظور کرنا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیار میں نہ تھا۔ البتہ جنگ کے زمانے میں کچھ پابندی کاغذ کی قلت کے پیشِ نظر عائد کی گئی تھی۔

## اچک زئی کا مقدمہ

پاکستان بننے کے بعد اخبارات کو ڈیکلریشن دینے سے انکار کیا گیا، لیکن یہ کارروائی سیکورٹی ایکٹ کے تحت کی جاتی تھی۔

نومبر ۱۹۵۷ء میں ایک مشہور مقدمہ پیش ہوا۔ صوبائی حکومت نے عبدالصمد خاں اچک زئی کو تین جرائد کے لیے ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دیا۔ سیکورٹی ایکٹ پاکستان ۱۹۵۲ء کے تحت اچک زئی نے ہائی کورٹ میں دعویٰ کر دیا اور ہائی کورٹ نے حکومت کے فیصلے کو خلافِ قانون قرار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت نے پھر ایک اور دفعہ کے تحت اخبار چھاپنے کی اجازت نہیں دی، لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ ڈیکلریشن نامنظور کرنے کے بارے میں حکومت کے اختیارات، قانونی طور پر جائز نہیں تھے۔ ۱۹۵۸ء کے شروع میں ہائی کورٹ نے مروجہ قانون کی اس دفعہ کو ناجائز قرار دیا جس کے تحت اخبار کے ڈیکلریشن کے ساتھ زرِ ضمانت طلب کیا جا سکتا تھا۔

اس زمانے میں اخبارات کے ایڈیٹر اور صحافی اخبارات سے متعلق قوانین میں ترامیم کا مطالبہ کر رہے تھے، چنانچہ پریس قوانین پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے پریس کمیشن قائم کیا گیا۔ کمیشن کی رپورٹ اگست ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کس حد تک کمیشن کے اراکین اس خوفناک تبدیلی سے متاثر ہوئے جو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں رونما ہو چکی تھی۔ کمیشن نے ڈیکلریشن کی تجدید کی شرائط نرم کرنے کی سفارش کی اور یہ تجویز پیش کی کہ اگر چھاپہ خانہ اخبار کے مقام اشاعت و طباعت میں عارضی تبدیلی ہو تو نیا ڈیکلریشن ضروری نہ سمجھا جائے۔ اس ضابطے میں ترمیم کر دی جائے جس کے تحت پرنٹر یا پبلشر کے ملک سے باہر جانے پر نیا ڈیکلریشن ضروری سمجھا جاتا تھا۔

اگر پرنٹر یا پبلشر تین مہینے سے کم مدت کے لیے ملک سے باہر جائے تو اس صورت میں نئے ڈیکلریشن کی بجائے صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دینا کافی سمجھا جائے۔

نہ جانے کن حضرات کی درخواست پر کمیشن نے یہ رائے قائم کی کہ ہر ایرے غیرے کو اخبار کا ڈیکلریشن داخل کرنے کا حق نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ڈیکلریشن داخل کرنے والے کے لیے ایک خاص معیار مقرر کیا گیا۔ کمیشن کی تجویز یہ تھی:

ڈیکلریشن داخل کرنے والا ہر شخص ڈیکلریشن داخل کرنے کے چھ ہفتے بعد اخبار نکال سکتا ہے، بشرطیکہ اس میعاد سے پہلے کسی وقت ممانعت نہ کر دی ہو۔

حکومت چھ ہفتے کی میعاد سے پہلے کسی وقت ممانعت کا حکم جاری کر سکتی ہے، لیکن اس حکم کے لیے مندرجہ ذیل وجوہات ضروری ہوں گی۔

الف: ناشر یا ایڈیٹر کو پانچ سال سے کم عرصہ قبل اخلاقی جرم پر سزا مل چکی ہو۔

ب: ناشر کے پاس معقول مالی وسائل موجود نہ ہوں۔

ج: ایڈیٹر ضروری صلاحیت کا مالک نہ ہو۔

د: پرنٹر یا پبلشر کے بارے میں حکومت کو باقاعدہ اطلاع

کے مطابق یقین ہو کہ اس کا عمل، ملک کے دفاع، خارجہ پالیسی یا تحفظ عامہ کے منافی ہوگا۔

اگر ایسا ہو تو حکومت اپنی معلومات سے ہائی کورٹ کے جج کو آگاہ کرے گی اور اگر جج فیصلہ کرے کہ یہ معلومات درست ہیں تبھی حکومت ممانعت کا حکم جاری کرے گی۔

کمیشن نے اپنی صوابدید کے مطابق ناشر کے ضروری مالی وسائل اور ایڈیٹر کی ضروری صلاحیت کے پیمانے بھی تجویز کیے۔

کمیشن نے ایڈیٹر کے لیے علمی استعداد کا یہ معیار تجویز کیا تھا:

(i) صحافت میں ڈپلوما

(ii) یا یونیورسٹی کی ڈگری یا قومی زبانوں میں اخبارات کے مدیران کے لیے علوم مشرقیہ کی مساوی ڈگری۔

(iii) یا اخبار کے دفتر میں کم از کم پانچ سال کام کرنے کا صحافتی تجربہ۔

مالی وسائل کے بارے میں کمیشن کی تجویز تھی کہ اخبار نکالنے والوں کے پاس حسب ذیل شرح کے مطابق سرمایہ کافی سمجھا جائے۔ یہ شرح اس حساب سے مقرر کی گئی تھی کہ ہر اخبار نکالنے والے کے پاس چھ مہینے کے اخراجات کا انتظام ہونا چاہیے:

i۔ انگریزی روزنامہ۔ ایک لاکھ روپیہ

ii۔ ملکی زبان میں روزنامہ۔ پچاس ہزار روپیہ

iii۔ انگریزی روزنامہ (شام کو شائع ہونے والا)۔ پچیس ہزار روپیہ۔

iv۔ انگریزی ہفت روزہ۔ بیس ہزار روپیہ۔

v۔ ملکی زبان میں ہفت روزہ۔ دس ہزار روپیہ

vi۔ انگریزی پندرہ روزہ یا ماہنامہ۔ آٹھ ہزار روپیہ

vii۔ ملکی زبان میں پندرہ روزہ یا ماہنامہ۔ چھ ہزار روپیہ۔

ایوب خاں کی حکومت نے کمیشن کی تجاویز اپنی حسب منشا ترامیم کر کے بخوشی منظور کر لیں اور ۱۹۶۰ء کے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اختیار دیا گیا کہ وہ ڈیکلریشن کی تصدیق ہرگز نہ کرے جب تک اسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ:

الف:۔ ڈیکلریشن داخل کرنے والا وہی شخص ہے جس کا نام اقرارنامے میں درج ہے۔

ب:۔ اخبار کا مجوزہ نام وہ تو نہیں جس نام سے کوئی اور اخبار پہلے سے شائع ہو رہا ہو۔

ج:۔ ڈیکلریشن داخل کرنے والے کو پانچ سال سے کم عرصہ قبل اخلاقی جرم پر سزا تو نہیں ہوئی۔

د:۔ پبلشر کے پاس معقول مالی وسائل ہیں۔

ہ:۔ ایڈیٹر معقول تعلیمی استعداد یا صحافتی تجربہ رکھتا ہے۔

(۱) حکومت کو اپنی اطلاع کے مطابق یقین ہے کہ پرنٹر یا پبلشر کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو ملک کے دفاع یا امور خارجہ یا تحفظ عامہ کے منافی ہو۔

زمانہ بہت نازک تھا لیکن یہ بھی کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز کی مجلس قائم نے دبی زبان ... یہ کہنے کی جرأت کی کہ ڈیکلریشن ... حکومت کو بہت وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں اور ... کا احتمال ہے۔

۱۹۶۳ء کے مغربی پاکستان (یعنی موجودہ) آرڈی نینس میں ڈیکلریشن کی یہ شرائط جوں کی توں باقی رہیں لیکن ۱۹۶۴ء کے ترمیمی آرڈی نینس (نمبر ۲۱، مجریہ نومبر ۱۹۶۴ء) کے تحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ڈیکلریشن نامنظور کرنے کے اختیارات میں توسیع کر دی گئی۔ اس ترمیمی قانون کی رُو سے ڈیکلریشن کی نامنظوری کی وجوہات بالا میں شق (ہ)، (و) کی جگہ تین نئی شقیں نافذ کر دی گئیں۔ وہ یہ تھیں:

۱. ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کسی ایسے پرنٹر یا پبلشر کا ڈیکلریشن تصدیق کرنے سے انکار کر دے گا جس کے بارے میں اس اطلاع کے مطابق جو اس کے قبضے میں ہو اور شخص متعلقہ کو صفائی کا موقع دینے کے بعد حکومت مطمئن ہو کہ وہ شخص کوئی ایسا کام کرے گا جو پاکستان کے دفاع یا امور خارجہ یا ملک کے تحفظ یا مغربی پاکستان میں تحفظ عامہ کے منافی ہو یا اخبار کو قابل دست اندازی تشدد آمیز جرم کی ترغیب دینے یا کسی کو رسوا کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔

۲. اس شق کے تحت ممانعت کا حکم جاری کرنے سے پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شخص متعلقہ کو صفائی اور ثبوت پیش کرنے کا موقع دے گا۔

۳. اس حکم کے خلاف حکومت مغربی پاکستان سے فریاد کی جا سکے گی اور حکومت چاہے تو اس حکم میں ترمیم کر دے، اسے منسوخ کر دے یا اس کی توثیق کر دے۔

۱۹۶۰ء کے آرڈی نینس کے بعد حکم جاری کیا گیا کہ تمام اخبارات جن کے ڈیکلریشن ۱۸۶۷ء کے ایکٹ کے تحت داخل کیے گئے تھے وہ نئے سرے سے ڈیکلریشن داخل کریں اور ظاہر ہے نئے ڈیکلریشن فارموں پر نئے اختیارات کا استعمال ہونا ضروری تھا چنانچہ بہت سے جرائد اور بعض اخبارات کے ڈیکلریشن ۱۹۶۱ء کے اوائل میں نامنظور کر دیے گئے۔

اس قانون کے تحت ایوب شاہی دور اور بھٹو دور میں جو دھاندلیاں کی گئیں وہ سب کو معلوم ہیں لیکن کس طرح ڈیکلریشن دیا ہی نہیں جاتا، یہ داستان بہت عبرت ناک ہے۔

# کشمیر

## بھارت کا اٹوٹ انگ نہیں پاکستان کا جزو لاینفک ہے

### پنڈت پریم ناتھ بزاز

مسئلہ کشمیر گذشتہ تیس سال سے پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازعہ چلا آرہا ہے۔ اس نزاع کے باعث ہی دونوں ملکوں کے درمیان اب تک تین خون ریز جنگیں ہو چکی ہیں اور ہنوز یہ مسئلہ لاینحل ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں ایک کشمیری ہندو رہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز نے جو آزاد کشمیر کے نظریہ کے خالق کی حیثیت سے آزادی سے پہلے بھی جانے پہچانے جاتے تھے اور جنہیں یہی نظریہ پیش کرنے کے جرم میں تقسیم ملک کے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ایک کتاب آزاد کشمیر کے عنوان سے لکھی، جس سے ان کے خیالات کے بارے میں مکمل ——— آگہی حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اس کتاب میں سوال و جواب کے اسلوب کو اپنایا ہے تاکہ آزاد کشمیر کے نظریہ کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا شافی جواب دیا جا سکے۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز کا فرقہ وارانہ آلائش سے پاک تصور آزادی، بالغ نظر اور انصاف پسند لوگوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ وہ نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کے بلکہ بھارت کے پہلے ہندو ہیں کہ جنہوں نے یہ بے باکانہ نعرہ لگایا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ نہیں پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔ ہم ذیل میں اس نادر و نایاب کتاب کی تلخیص پیش کر رہے ہیں ——— (ادارہ)

## ہندوستان کہ پاکستان؟

سوال ——— میں کشمیر کے مستقبل کے بارہ میں آپ کے خیالات جاننا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستانی ہیں اور مسلم لیگ کے نظریۂ جداگانہ قومیت کو مانتے ہیں۔ میرے خیال میں بھی آپ کشمیر کے پاکستان کے الحاق کی حمایت کرتے ہیں۔ اور موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے کے سخت خلاف ہیں۔ مجھے اس پر سخت اچنبھا ہوا ہے کیونکہ یہ ایک عجیب سی بات ہے آپ جیسا تعلیم یافتہ ہندو جو ایک کہنہ مشق سیاست دان اور اپنی روشن خیالی کے لئے کافی مشہور ہے۔ اس قسم کے زالے اور فرقہ وارانہ اعتقادات رکھتا ہو۔ میری رائے میں یہ باتیں ایک دیش بھگت کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

جواب ——— میرے سیاسی نظریات کے متعلق آپ نے جو باتیں بھی سنی ہیں۔ وہ یا تو مسخ شدہ ہیں یا بے بنیاد۔ میں اس مفہوم میں پاکستانی نہیں ہوں۔ جو پاکستان کا موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ بتاتا ہے۔ میں مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ کو بھی نہیں مانتا۔ میں نے لیگی تصورات کی ہمیشہ نکتہ چینی کی ہے اور دو قومی نظریے کی دس سال ہوئے میں اس وقت مخالفت کی تھی۔ جب پہلی بار اسے قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے سامنے اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔ میں نے بلا مبالغہ ان گنت مضامین روزنامہ "ہمدرد" میں لکھے جن میں ثابت کیا گیا تھا۔ کہ اس نظریہ پر عمل کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی۔ اور اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ میری کتاب "گاندھی ازم"۔ "جناح ازم اور سوشل ازم" میں جو شاید آپ نے نہیں دیکھی صاف لکھا ہے۔ کہ برِعظیم ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔ ان کو محض مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان میں یگانگت کی اور بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس کے باوجود اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے اس امر کی ہمیشہ تائید کی ہے کہ کشمیر کو صرف پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے اور بھارت کے ساتھ شامل نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی فوجوں

ہے ریاستی باشندوں کی مرضی کے خلاف کشمیر پر قبضہ جما رکھا ہے۔ یہ اقدام سراسر مشیانہ چھینا جھپٹی ہے۔ جو کسی صورت بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اس کا نتیجہ خطرناک ثابت ہوگا۔ اس وقت تو صرف مسلمان ہی بھارتی حکومت کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ مگر آگے چل کر بدقسمتی سے اگر یہی صورتِ حال رہی۔ تو ہندوؤں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ جو شاید مسلمانوں کی نسبت زیادہ تلخ ہو۔ لہٰذا میں پکا ہندو اور سچا کشمیری ہونے کی حیثیت سے یہ مطالبہ کروں گا۔ کہ ہندوستانی فوجیں میرا پیارا وطن چھوڑ دیں۔ کشمیری عنقریب خود کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے گی۔ وہ مملکتِ ہندوستان ہو یا پاکستان۔ وہ صرف اس طرف جھکیں گے جدھر ان کا اپنا فائدہ ہوگا۔

آپ کے خیال میں قوم پرستی یا غیر مذہبیت صرف بھارت اور کانگرس کی اجارہ داری ہے۔ اور ایک سمجھے ہوئے قوم پرست کا عین فرض ہے۔ کہ وہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی ڈٹ کر حمایت کرے۔ خواہ کشمیری عوام اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ معاف رکھنا! میں تعصب کی اس بیماری کا شکار نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے سیاسی نظریات معتدل اور سائنٹیفک ہوں۔ میں گاندھی نظریۂ قومیت کا اتنا ہی نکتہ چین ہوں جتنا کہ فرقہ پرستوں کے دو قومی نظریہ کا۔ ہندو پریس نے اپنے ان تھک اور لگاتار پراپیگنڈے سے آپ کو اس فریب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ "کانگرس ہی صرف متحدہ قومیت کی علم بردار جماعت ہے۔ اور وہ کسی فرقہ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ جمہوریہ ہند ایک ایسی لادینی حکومت ہے۔ جہاں تمام فرقوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک برتا جاتا ہے۔" نظر اور سمجھ کے اس دھوکے کو آپ نے دیو بانی سمجھ لیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں۔ کہ دوسرے لوگ بھی اندھا دھند آپ کی پیروی کرنے لگ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے خیالات آپ کے نزدیک قوم پرستی کے خلاف قابلِ گردن زدنی ہیں۔

آپ کو علم ہے کہ قوم پرست لیڈر اپنے ان لمبے چوڑے دعووں کے باوجود کہ ہندوستان اکھنڈ رہے گا۔ چپکے سے پاکستان کے قیام کو مان گئے برِ عظیم کی تقسیم فرقہ وار بنیادوں پر ہوئی۔ ملک کا وہ حصہ جہاں ہندو زیادہ تھے۔ ہندوستان کہلایا اور جن علاقوں میں مسلم اکثریت تھی۔ الگ کر کے پاکستان بنا دیا گیا۔ کانگرسی مہاپرشوں نے دعوے کیا کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے باشندے گاندھی جی کے فلسفہ کے شیدائی ہیں۔ اور وہ کبھی پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہوں گے۔ اس قسم کا دعوے آسام کے ایک ضلع سلہٹ کے بارے میں بھی کیا گیا یہاں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن جوں ہی رائے عامہ معلوم کی گئی۔ حقیقت ظاہر ہوگئی۔ اور کانگرس کے سارے دعوے باطل ثابت ہوگئے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان برِ عظیم کے سارے مسلمانوں کے لئے متحدہ قومیت کے نظریہ میں کوئی کشش نہیں ہے۔ اور وہ ہر صورت میں اپنا الگ وطن بسا کر رہنا چاہتے ہیں۔

کشمیر میں بھی مسلمان گنتی میں سب سے زیادہ ہیں۔ لہٰذا دانش مندی اور جمہوریت کا تقاضا ہے کہ یہ خطہ بھی پاکستان کے ساتھ شامل ہو۔ سلہٹ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے انجام کو جانتے ہوئے پھر یہ زعم کرنا سراسر نادانی ہے کہ کشمیری مسلمان ہندوستان کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔ چنانچہ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور رفع شک کے لئے میں نے اور مجھ سے متفق لوگوں نے ستمبر ۱۹۴۷ء کے شروع میں اس امر پر زور دیا کہ کشمیر کی گتھی بالغوں کو رائے دہندگی کا حق دے کر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب سے سلجھائی جائے۔ اگر یہ سچی دیش بھگتی، جمہوریت نوازی اور قوم پرستی نہیں ہے۔ تو میں حیران ہوں کہ پھر اور کیا ہے؟

سوال ——— پاکستان محض مسٹر جناح کی ہٹ سے بنا جس کی حوصلہ افزائی برطانوی سامراج نے کی۔ اب جبکہ انگریز جا چکا ہے کسی صورت بھی کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ناطہ جوڑنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ یہ خطہ ہندوستان کا جزوِ لاینفک ہے میرا خیال ہے کہ اگر کشمیر ہندوستان سے کٹ گیا اور پاکستان کے ساتھ مل گیا تو اس کے لئے بہت نقصان دہ ہوگا۔

جواب ——— آپ نے تقسیم ہند کے اسباب کا جو جائزہ لیا ہے۔ وہ غلط ہے۔ آپ کے اس دعوٰی کی بنیاد عام ہندوؤں اور گاندھی بھگت قوم پرستوں کا وہ نقطۂ نظر ہے۔ جس کو کانگرسی پریس اور راہنماؤں نے سختی سے اپنا رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ اگر کانگرس کے کرتا دھرتا دوسرے فرقوں کے حقوق کی حفاظت کے دعووں کا عملی ثبوت دیتے اور کسی قسم کا امتیازی سلوک نہ برتا جاتا تو تقسیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان بھر میں کانگرس کی گدی گاندھی جی کے قبضہ میں تھی۔ یہ تنظیم "ہندو جاگرتی" کے رنگ میں رنگ گئی۔ لڑائی تو انگریز کے خلاف لڑی جا رہی تھی۔ لیکن مہاتما جی کا نعرۂ جنگ یہ تھا کہ "ویدک زمانے کی طرف لوٹ چلو۔" بلاشبہ پس ماندہ اور مذہب زدہ ہندو عوام میں اس نعرے نے جذباتی بیداری پیدا کر دی۔ لیکن یہ ضرر رساں بھی ثابت ہوا کیونکہ تمام غیر ہندو لوگ خاص کر مسلمان سخت متنفر ہوگئے۔ وہ یہ خطرہ محسوس کرنے میں حق بجانب تھے۔ کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد اگر کانگرس برسرِ اقتدار آگئی۔ تو ان کے دین اور ان کی تہذیب کو نقصان پہنچے گا۔ وہ اس نازک وقت کسی اچھے راہنما کی تلاش میں تھے۔ جو ان کو قائدِ اعظم کی شخصیت میں مل گیا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کی اس دبی دبی سی خواہش کو دو قومی نظریے کی صورت میں نمایاں کر دیا۔

گاندھی ازم اگر ترقی پسند اصول پر قائم رہتا۔ تو اس کا تانا بانا اس برِ عظیم کے تمام فرقوں کے اتحاد اور جذبۂ قوم پرستی سے تیار ہوتا۔ اور اس پر ہندو تہذیب کے احیاء کا رنگ نہ چڑھایا جاتا۔ تو مسلمان کبھی قائدِ اعظم کے دو قومی نظریہ کے قریب نہ جاتے۔ قائدِ اعظم کے الفاظ نے کروڑوں مسلمانوں پر جو جادو کا سا اثر کیا۔ اس بات کا کیا بیّن ثبوت نہیں ہے کہ جو کچھ وہ کہتے تھے اس میں سچائی پائی جاتی تھی؟ یہ کہہ دینا بالکل نادانی ہے کہ کروڑوں مسلمانوں نے جن میں بڑے بڑے دانشور بھی تھے۔ مسٹر جناح کی پیروی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ انگریز کے اشارے پر کی۔ اگست ۱۹۴۷ء تک مسٹر جناح کے پاس کوئی حاکمانہ اقتدار نہ تھا۔ حتٰے کہ ان کی سیاسی آلۂ کار جماعت مسلم لیگ بھی تنظیمی لحاظ سے کانگرس کے مقابلہ میں بہت کمزور تھی۔

اپنے نظریات کی نشر و اشاعت کے لئے ان کے پاس کوئی پریس بھی نہ تھا۔ پھر بھی وہ گاندھی نیشنلزم کے خلاف تمام منتشر قوتوں کو جمع کر کے صف آرار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر کانگرس جیسی با اثر جماعت میں کوئی بنیادی نقص نہ ہوتا۔ تو مسلمان اس کو چھوڑ کر لیگ میں کیوں شامل ہوتے۔ واقعی اس تنظیم میں بنیادی نقص تھا۔ اور وہ صرف ایک فراخ دل انسان ہی کو نظر آسکتا ہے۔ وہ نقص یہ تھا کہ گاندھی ازم کی اساس ترقی پسندانہ قوم پرستی پر نہیں تھی۔ نہ ہی وہ فرقہ واریت سے بالاتر تھا۔ یہ تو ایک تنگ نظر ہندو فرقہ پرستی ہے۔ جس نے ہندوستانی قومیت کا سوانگ رچایا ہوا تھا افسوس تو اس بات کا ہے کہ کانگرس کے پراپیگنڈا کا فریب کھاتے ہوئے ہند اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکے۔ جوں جوں مسٹر جناح اور مسلم لیگ مقبول ہوتی گئی۔ ہندو اپنی فرقہ پرستی کو گاندھی نیشنل ازم میں چھپا کر مسلمانوں پر فرقہ پرستی کا الزام دھر کر انہیں برا بھلا کہتے رہے۔ ایک دوسرے کے خلاف اس مہم بازی نے دونوں قوموں میں ناچاقی کی خلیج وسیع کر دی۔ اور پاکستان بن کر رہا۔ کانگرسی راہنماؤں نے تقسیم کو اس لئے نہیں مانا کہ انگریز کا دباؤ تھا بلکہ گاندھی جی کے اس فلسفہ کا قدرتی رد عمل تھا۔ جس پر وہ کاربند چلے آ رہے تھے۔ مسٹر جناح کے نظریۂ جداگانہ قومیت کے پیش کرنے سے کئی برس پہلے سے ہندو خود دھیرے دھیرے اسی نصب العین (ہندو فرقہ پرستی) کو اپنا چکے تھے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن جو تقسیم ہند کے ڈرامے کا رسوائے عالم فنکار بھی ہے۔ کانگرسی راہنماؤں کی رائے میں اب تک ہندوستان کا سچا دوست سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تشکر اور دوست نوازی کے جذبہ میں سرشار ہو کر ان راہنماؤں نے اس کو گورنر جنرل ایسے عہدہ کے سنگھاسن پر بھی بٹھایا۔ لہذا یہ کہنا کہ تقسیم کو انگریزی سامراج کے دباؤ سے مجبور ہو کر کانگرسی مہا پرشوں نے مان لیا تھا۔ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

جو کچھ برعظیم ہندوستان کے معاملہ میں بیت چکا ہے۔ وہی کچھ جلد یا بدیر کشمیر کے معاملہ میں بھی کانگرسی راہنماؤں کو دیکھنا ہے۔ ان کو نظر آنے لگا۔ کہ ان کی ساری تگ و دو کے باوجود ریاستی مسلمان ہندوستان کے ساتھ الحاق کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے لئے پاکستان میں قدرتی کشش ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں۔ خاص کر تمدنی یگانگت اور مذہبی رشتہ نے ان کو پاکستانی عوام کے بالکل قریب کر رکھا ہے۔ یہی اسباب کانگرسی لیڈروں کو مجبور کریں گے۔ کہ وہ ریاست کشمیر سے دست بردار ہو جائیں۔ تقسیم سے پہلے کشمیر واقعی ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ لیکن اب دونوں کا ناطہ مخدوش اور ناپائیدار ثابت ہوگا۔ خطۂ کشمیر پاکستان کا ایک قدرتی جزو ہے اس کو ہر صورت میں پاکستان کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ آپ کا یہ کہنا کہ ہندوستان سے الگ ہو کر پاکستان میں شامل ہو جانے سے کشمیر تباہ ہو جائے گا ایک خوش فہمی سے زیادہ نہیں ہے۔ جس میں آپ کو نام نہاد قوم پرستی کی پہیلی نے مبتلا کر رکھا ہے۔ ورنہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

سوال ——— مہاتما گاندھی کی تعلیمات ہمہ گیر تھیں انہوں نے تمام قوموں اور طبقوں کی آزادی۔ ترقی اور آسودگی کے لئے جنگ کی۔ ان کے مقابلہ میں جناح صاحب ایک فرقہ پرست اور تنگ خیال لیڈر تھے ان ہر دو میں کوئی وجہ مشترک نظر نہیں آتی۔ اگر مسلمان مذہبی دیوانے نہ ہوتے اور ان میں وطن کی محبت کا تھوڑا سا بھی جذبہ ہوتا تو وہ ضرور مہاتما جی کی قیادت قبول کرتے۔ مسٹر جناح کی غلط راہنمائی نے ان کو ایسی راہ پر لگایا جس نے یہ ساری تباہی مچائی۔ ہزاروں انسان مارے گئے۔ لاکھوں بے خانماں ہو گئے۔ کیا ایسے حالات میں کشمیری مسلمانوں کو مسٹر جناح کی بنائی ہوئی راہ چھوڑ کر گاندھی مت ایسا شاندار اور ہمہ گیر عقیدہ اختیار نہ کرنا چاہیئے۔

جواب ——— آپ نے گاندھی فلسفہ اور قائد اعظم محمد علی جناح کے نظریہ کے متعلق جو کچھ خیال آرائی کی ہے یہ ایک معمولی درجہ کے نیشنلسٹ کا سطحی جائزہ ہے۔ لیکن ایسے مشاہدات نکتہ رس اور سمجھدار لوگوں کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اگر ہم دونوں راہنماؤں کے سیاسی نظریات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں کا پس منظر ایک جیسا ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک ہندوؤں کا لیڈر ہے اور دوسرا مسلمانوں کا۔ اس لئے دونوں نے اپنے واسطے الگ الگ راہ عمل اختیار کی۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک ہی مقصد کے لئے لڑ رہے تھے۔ گاندھی جی کی سیاسی تعلیمات ہمہ گیر ہیں یا کہ نہیں اس سے قطع نظر یہ صرف ایک تڑپ ہی تھی۔ جو مہاتما جی ہندو جاتی کی آزادی کے لئے اپنے سینے میں ہی رکھتے تھے۔ یہ ایک رجعت پسندانہ قوم پرستی تھی۔ جس کی آبیاری ویدوں اور پرانوں کے پراچین عہد سے کی جا رہی تھی۔ بھلا ایک غیر ہندو کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ گاندھی جی کی وقت بے وقت بیان بازیوں کے باوجود یہ کانگرسی نیشنل ازم عملی لحاظ سے سب کے لئے نہ تھا۔ اس کی بنیاد تنگ دلی۔ جبر اور غیر ہندوستانی نسلوں کے ساتھ نفرت پر رکھی گئی تھی۔ اس ماحول میں مسلمان بھی صرف اس لئے بدیشی قرار دیئے گئے۔ کہ ان کا مذہب و تمدن ہندوستانی نہ تھا۔ بلکہ عرب سے آیا تھا۔ یہ نقطۂ نگاہ ہندوؤں کے ذہن میں کافی پکا ہوتا گیا۔ اور آخرکار جناح ازم کا ظہور اس کا رد عمل تھا۔ جس طریقے اور جن اصولوں پر گاندھی جی نے ہندوؤں کو ابھارا تھا۔ اسی طریقہ اور انہی بنیادوں پر قائد اعظم نے مسلمانوں کو ابھارا۔ انہوں نے بھی اسلامی دورِ ماضی کی شاندار تاریخ کا حوالہ دے کر عوام میں قدامت پرستی اور سخت گیری کے رجحانات کو گرمایا۔ فرق یہ تھا کہ جناح صاحب زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آفاقی ہونے کا عالم فریب ڈھونگ کیا۔ وہ اگرچہ کم گو تھے۔ مگر بے باک۔ باون تولے پاؤ رتی کی کھری کھری کہتے بھی تھے۔ اور اس پر سختی سے عمل بھی کراتے تھے۔ غرض وہ ایک منجھے ہوئے سیاست دان تھے۔

جناح ازم اور گاندھی ازم دونوں قدامت پسند اور رجعت پرست عقیدے ہیں۔ دونوں اونچے طبقہ اور لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی حمایت روا رکھتے ہیں۔ دونوں نچلی سماج کے جاہل عوام میں پھل پھول سکتے ہیں ہر دو عقل کم اور جذباتی زیادہ ہیں۔ جب تک برعظیم ہندوستان کے لوگ

جل۔ تنگ نظر اور توہم پرست ہیں۔ جب تک ان میں ابھرنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ یہ دونوں سیاسی نظریئے ان میں کافی پنپ سکتے ہیں۔

صرف وہی لوگ جن کی نگاہیں دوربین نہیں ہیں خیال کر سکتے ہیں۔ کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اگر اکھل بھارتی اور سرمایہ دار ہندو حرص و طمع کے باعث اندھے نہ ہو گئے ہوتے۔ اور ان کے دل میں مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کا جذبہ اور ان کے عقائد کا احترام ہوتا۔ تو سارے ہندوستان میں قائد اعظم اور مہاتما جی ہی وہ پایہ ناز ہستیاں تھیں جو ایک دوسرے کے مخالف رخ چلنے کی بجائے متحد اور متفق ہو جاتیں اور آج ایک نیا ہندوستان جنم لیتا۔

سوال ——— آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ آپ گاندھی ازم کو بھی رد کرتے ہیں۔ حالانکہ اس نے فرقہ پرستی سے پاک رہ کر متحدہ قومیت کا درس دیا ہے۔ اور موجودہ جمہوریہ ہند انہی روشن اصولوں پر ایک لادینی حکومت کی حیثیت سے قائم کی گئی ہے۔ آپ جناح ازم سے بھی متفق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ فرقہ پرستی پر قائم ہے آزادی کے بلند آدرش کی خاطر آپ کا فرقہ پرستی کو اچھا نہ سمجھنا قابلِ تعریف ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ پھر آپ کا سیاسی موقف کیا ہے۔ جبکہ گاندھی ازم ایسی غیر فرقہ وار تحریک کے بھی آپ قائل نہیں ہیں کیا آپ اس کو کھول کر بیان کریں گے؟ اس کے ساتھ ہی حُبِّ وطنی اور قومیت کے بارہ میں آپ کا جو نظریہ ہے وہ بھی سمجھا دیجئے۔

جواب ——— مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ محسوس ہوتا ہے کہ گاندھی ازم جو کچھ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ دراصل وہ نہیں ہے اس کے دو بڑے سبب ہیں۔ پہلا گاندھی ازم کا مقصود صرف پراچین براہمنی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ یہ ایک طرح کی تنگ خیالی ہے۔ اور سراسر فرقہ وارانہ عقائد اور ویدانت پر مبنی ہے۔ پس گاندھی ازم نے اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود دوسرے فرقے کے لوگوں کی ساری ہمدردیاں کھو دیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جتنے گاندھی بھگت ہیں۔ وہ سب عمل کے اعتبار سے منافق ہیں۔ کانگرسی راہنماؤں کے بیانات اور قرار دادیں اکثر دل کش انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ اور آپ عموماً مبہوت ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو کچھ ان پر عمل ہوتا ہے اسے آپ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ گاندھی ازم نے جب بھی ملک کے سیاسی۔ سماجی اور آرتھک معاملات کو ہاتھ میں لیا۔ اس میں مہا سبھائیوں کی سی روش اختیار کی۔ اور صرف ہندو کا ہی فائدہ سوچا تاکہ صرف یہی فرقہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کر سکے۔ اس لحاظ سے یہ جناح صاحب کی فرقہ پرستی سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ کئی لحاظ سے اس سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ماننے والوں میں منافقت اور احساس برتری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایک عام ہندو باوجودیکہ وہ عملی طور پر بدترین قسم کا متعصب۔ رجعت پسند اور نسلی برتری کا قائل ہوتا ہے بھی اس زعم میں گرفتار رہتا ہے کہ وہ محض اس لئے مہاپرش ہے کہ وہ گاندھی جی کی

انسانیت پرور تعلیم کا ماننے والا ہے۔

انسانی ترقی اور آسودگی کا تقاضا ہے کہ گاندھی ازم اور جناح ازم دونوں سے کنارہ کشی کی جائے۔ کیونکہ یہ ہر دو سخت نقصان دہ ہیں۔ یہ انسانی آزادی کی منزل کی طرف راہنمائی نہیں کر سکتے۔ ہمیں لازماً غیر مذہبی سیاست کی بنیادوں پر ایک ایسا نظام تیار کرنا پڑے گا۔ جو سر تا پا معقولیت پسند۔ مستحکم۔ غیر جذباتی اور انسانیت پرور ہو۔ اس کا حصول گاندھی بھگتوں کے کھوکھلے دعووں سے ناممکن ہے۔ ہمیں پہلے اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کرنی چاہیئے۔ جس اصول پہ ہم روزمرہ آسانی سے عمل نہیں کر سکتے اس کا پرچار بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ کہنا فضول ہے کہ تصورات تو بلند ہیں عمل نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہو تو یہ تصورات ہی نہیں ہیں۔ لیکن معقول تصورات انسانی عمل کی پہنچ سے باہر نہیں ہوتے۔ صرف غیر عقلی تصورات انسان کی عملی زندگی میں نہیں لائے جا سکتے۔ گاندھی ازم ایک طرف تو رام راجیہ اور قدیم براہمنی تہذیب کے احیاء کا خواب دیکھتا تھا۔ دوسری طرف ہندو اور مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ باتیں متضاد اور غیر عقلی تھیں لہٰذا گاندھی ازم ناکام ہوا۔

اس وقت تک ہند اور پاکستان میں ترقی اور آسودگی محال ہے جب تک یہ دونوں ملک فرقہ وارانہ رجعت پسندانہ رجحانات اور پرانی تہذیب کو زندہ کرنے کی روش کو ترک نہیں کرتے۔ یہ پالیسی پاکستان کی طرح کھلم کھلا ہو۔ یا ہندوستان کی طرح نت نئے اعلانات کے بھروپ میں ہو ہمیں ہر حال میں اپنی ناؤ کو تنگ خیالی۔ نسلی عصبیت۔ مذہبی جنون اور قومی غرور کے ان خطرناک لنگروں اور پتھروں سے بچ کر کھینا چاہیئے۔ غیر مذہبی نظامِ حکومت سب سے اچھا نظام ہے۔ بشرطیکہ مذہبی پاسداری سے مبرا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نظام میں مذہب کو کچل کر رکھ دیا جائے۔ بلکہ ہر فرد و بشر کو اپنے مذہب۔ پنتھ اور دھرم پر چلنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے صرف حکومت کو براہ راست یا بالواسطہ کسی مذہب کی بھی پاسداری نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ بات نہ تو جناح ازم میں ہے اور نہ ہی گاندھی ازم میں۔ ہندوستان کی حکومت پراچین تہذیب اور قدیم ہندوستانی تمدن کی حفاظت کے پردوں میں ہندو دھرم کی حمایت کر رہی ہے۔ مثلاً گاؤکشی رفتہ رفتہ ممنوع قرار دی جا رہی ہے۔ مشہور پرانے مندروں کو واگذار کیا جا رہا ہے۔ ہندی اور سنسکرت بطور زبان لوگوں پر ٹھونسی جا رہی ہے۔ اسی طرح پاکستان کے راہنما جن میں موجودہ حکومت کے وزراء بھی شامل ہیں۔ اعلانیہ کہتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اور اس کی حکومت شریعتِ اسلامیہ کے مطابق چلائی جائے گی۔ ایسی صورت میں دونوں حکومتیں عوام کی صحیح آزادی کے موافق نہیں ہیں۔

قوم پرستی اور دیش بھگتی اچھے مقاصد ہیں۔ بشرطیکہ حدِ اعتدال سے باہر نہ ہوں۔ ایک شخص دھرتی کے ایک خاص خطہ میں جنم لیتا ہے۔ قدرتی طور پہ اسے اس خطے کے دوسرے باشندوں۔ اس کے پرندوں۔ حیوانوں۔ پہاڑوں۔ دریاؤں اور جنگلوں سے نسبتاً زیادہ انس ہو گا۔ اس کا انسان

دوستی کا ہمہ گیر جذبہ اپنے ہم وطنوں کی خدمت اور سیوا کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس حد تک حب وطنی اور قوم پرستی واقعی لائق ستائش اوصاف ہیں۔ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ ان کا غلط مفہوم لینے سے یہی انسانی اوصاف نفرت انگیز برائیاں بن جاتے ہیں۔ آجکل کی قوم پرستی اور دیش بھگتی کا یہ مطلب ہے کہ دوسری تمام غیر قوموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اپنی قومیت تب ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ کہ دوسروں کو ان کے جائز حق آزادی سے محروم کرکے ہمیشہ کے لئے غلام بنا لیا جائے۔ چنانچہ اسی قوم پرستی اور وطن دوستی کا یہ نعرہ ہے کہ "میرا وطن ہر حال میں سب سے اچھا ہے۔"

اس طرح عدل۔ مساوات اور حق پسندی کی تھوڑی بہت رمق بھی ان قوم پرستوں اور دیش بھگتوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظام میں یہ عقیدہ ایک بیماری بن جاتا ہے۔ آدمیت سے پیار رکھنے والوں کو اس سے بچ کر رہنا چاہیئے ہمیں چاہیئے کہ اپنے غلط کار حکمرانوں کو جرأت مندی سے ٹوکیں۔ اور منہ پر کہہ دیں۔ کہ جناب من! آپ نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اور یہ ٹھوکر خطرناک ہو گی ہمیں ایسے ملک کی مدد کے لئے بے پرواہ ہو کر میدان میں کود پڑنا چاہیئے۔ جس کو ایسے دیش بھگتوں اور قوم پرستوں نے اپنی حرص کا ہدف بنایا ہوا ہو۔

کوئی بھی تنگ نظر قوم پرست اور محب وطن اپنے ملک کو سچی آزادی نہیں دلا سکتا۔ وہ جو دوسروں کا حق ہڑپ کرنے کی ہوس میں ہوں۔ کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ صرف وہی لوگ جو آزادیٔ وطن کا مطلب ساری انسانیت کی آزادی سمجھتے ہوں۔ اور اس پر عمل بھی کرتے ہوں۔ ہمیں آزاد کرانے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمیں دیانت داری اور بے لوث جذبۂ خدمت سے جدوجہد کرکے ایسی قومیت کو کشمیر میں جنم دینا ہوگا۔ جو کل انسانیت کی آزادی کی ضامن ہو سکے۔

سوال ——— آپ جانتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا۔ لوگوں کو لوٹا اور مارا۔ عورتوں کی آبروریزی کی۔ اس ساری تاخت و تاراج میں پاکستان کا ہاتھ تھا۔ مہاراجہ نے صرف مجبور ہو کر ہندوستان سے مدد مانگی۔ کشمیری عوام کے صحیح نمائندوں نے (جو نیشنلسٹ ہیں) بھی اس کی تائید کی۔ ہندوستان نے اپنی فوجیں بھیج کر ہمیں [illegible] غارت گری سے بچا لیا۔ اس طرح اس نے انسانیت کا احترام کرکے اپنی اخلاقی سربلندی کا ثبوت دیا۔ اس کے برعکس پاکستان نے قبائلیوں کی نہ صرف اخلاقی حمایت کی بلکہ عملی طور پر ان کی کمک کے لئے اپنی فوجیں بھیجیں۔ ہم ہندوستان کی مروت اور پاکستان کی دشمنی کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کی نگاہوں میں ہندوستان کا اخلاقی موقف بہت اونچا ہے۔

جواب ——— پیشتر اس کے کہ ہم کسی پر یک طرفہ فرد جرم عائد کریں [illegible] یہ بات معلوم کریں کہ حملہ آور کون ہے؟ ضروری ہے کہ ہم اکتوبر ۱۹۴۷ء کی قبائلی مداخلت سے پہلے اور بعد کے حقائق کا جائزہ لیں۔ بھارت کے اکثر لوگ ایسا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ غلط رائے قائم کرنے کی ٹھوکر کھاتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ ہندوستان جون ۱۹۴۷ء میں ماؤنٹ بیٹن تجویز کے مطابق مذہبی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس تجویز میں کشمیر کا مستقبل بالکل واضح تھا۔ اس کے لئے سوائے پاکستان کے ساتھ الحاق کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ لیکن فوراً بعد کانگرسی راہنماؤں نے نتائج سے آنکھیں بند کرکے مہاراجہ کو مسلم اکثریت کی خواہش کے خلاف ہندیونین سے ناطہ جوڑنے کے لئے اکسانا شروع کیا۔ اس سال مہاتما گاندھی اگست کے پہلے ہفتہ میں کشمیر آئے۔ اور مہاراجہ کے ساتھ بات پکی کر گئے جیل میں نیشنلسٹ اراکین سے بھی بات چیت ہوئی۔ وہ بھی اس شرانگیز اور تباہ کن منصوبہ کو مان گئے۔

مہاراجہ سے کہا گیا کہ وہ غیر جانبداری کا سوانگ رچائے رکھے۔ لیکن راج دربار کی پالیسی نے چغلی کھائی۔ کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ عین اس موقع پر نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس دونوں جماعتوں کے لیڈر جیلوں میں تھے۔ اول الذکر پر بغاوت کا الزام تھا۔ اور مؤخر الذکر صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں نظربند تھے۔ نیشنلسٹ لیڈر کافی لمبی میعاد کے لئے سزا یافتہ قیدی ہونے کے باوجود اچانک رہا کر دیئے گئے۔ لیکن مسلم کانفرنس کے کارکن جو محض نظربند تھے۔ دانستہ آہنی سلاخوں کے پیچھے رکھے گئے۔ وہ تمام اخبارات جنہوں نے الحاق پاکستان کے لئے زور دیا اور ہندیونین کے ساتھ ناطے کی مخالفت کی یا تو بالکل بند کر دیئے گئے یا قانونی شکنجے میں جکڑ دیئے گئے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کی زبان بندی ہوئی۔ کئی ایک قید کر دیئے گئے۔ بہت سے جلاوطن ہوئے صرف نیشنلسٹ لیڈر ہی مزے میں تھے۔ یہ کھلم کھلا میٹنگیں کر سکتے تھے۔ اور جلسے جلوس نکال سکتے تھے۔ اسی دوران میں پونچھ کے نہتے لوگوں پر ڈوگرہ فوجوں نے گولیاں برسائیں۔ اور کئی گاؤں جلا دیئے یہ سارا واقعہ اگست۔ ستمبر۔ اور اکتوبر میں رونما ہوا۔ مہاراجہ کو ساری صورت حال سے کئی بار خبردار کیا گیا۔ لیکن یہ بے سود ثابت ہوا۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قبائلی مجبور ہو کر اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے آگئے۔ یہ بالکل خستہ اور شکستہ حالت میں تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کو حملہ آور کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ہم کسی قبائلی دستے [illegible] لوٹ کھسوٹ کے انفرادی فعل کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ لیکن ہمیں معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ اس اجتماعی حیثیت میں اس یلغار میں کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ صاف عیاں ہے۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ کشمیری عوام کو مہاراجہ کے مظالم اور ہمنوا نیشنلسٹ کارکنوں کی لوٹ مار سے چھڑایا جائے۔ ہمیں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ہندوستانی فوجوں نے کچھ کم غارت گری اور عورتوں کی آبروریزی نہیں کی۔

اس صورت میں جبکہ ہندوستان فرقہ وارانہ لحاظ سے تقسیم ہو چکا تھا کانگرسی لیڈروں کا کوئی حق اخلاقی نہ تھا۔ کہ وہ کشمیر پر چڑھ دوڑیں خصوصاً اس حالت میں جبکہ انہوں نے نواب جوناگڑھ کے اعلان الحاق پاکستان کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا پنڈت جواہر لال نہرو کی

نئی نئی تاویلوں کے باوجود بھارت کا کشمیر پر قبضہ جمائے رکھنا آئینی اور جمہوری لحاظ سے صریحاً ناجائز ہے۔ یہ افسوسناک واقعہ ہمیشہ تاریخ ہند کے دامن پر ایک بدنما دھبہ بن کر رہے گا۔

سوال ——— آپ کشمیر کی گتھی پرامن اور دوستانہ طریقے پر سلجھانے میں آپ کون سا طریقۂ کار تجویز کر سکتے ہیں؟

جواب ——— سنیئے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ مسئلہ ہر بالغ کو رائے دہندگی کا حق دے کر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے سے حل کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ضروری ہوگا کہ تمام غیر کشمیری فوجیں خواہ باقاعدہ ہوں یا بے قاعدہ۔ پاکستان کی ہوں۔ یا ہندوستان کی ریاست سے نکل جانی چاہئیں۔ ریاست کا تمام نظم و نسق نیک نام اور غیر جانبدار ہاتھوں میں سونپا جائے۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو پبلک کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی سہولت ملنی چاہیئے۔ کسی غیر ریاستی فرد یا جماعت کو ریاست میں داخل ہو کر کسی قسم کے سیاسی پراپیگنڈے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد عوام جو بھی فیصلہ کریں۔ متعلقہ لوگوں کو اس کے سامنے جھکنا ہوگا۔

سوال ——— کیا آپ اس امر سے بے خبر ہیں کہ کشمیری مسلمان مسلم کانفرنس کے مذہبی نعرہ کی رَو میں بہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مسلمان عوام تعلیمی اور ذہنی تربیت کے لحاظ سے بہت پس ماندہ ہیں۔ ان میں صحیح ترقی و آزادی کی قدر و قیمت پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہے مجھے ڈر ہے۔ کہ یہ معاملہ کی اہمیت کے احساس سے اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنے ہم مذہب اور پاکستانی خیال کے لوگوں کی جذباتی اپیل سے متاثر ہو کر کریں گے۔ میں آپ سے اس بات میں متفق ہوں کہ بہت تھوڑے ایسے مسلمان ہوں گے۔ جو ہندوستان کو اپنا ووٹ دیں گے لیکن پھر بھی میں کہوں گا کہ ہندوستان کے حق میں ووٹ دینا ان کے قومی مفاد کا ضامن ہوگا۔ ہندوستان ایک جمہوری۔ غیر مذہبی اور ترقی خواہ نظام حکومت ہے۔ کانگرس کے لیڈر بارہا اس کا اعلان کر چکے ہیں۔ ہمارا دستور و آئین ان اعلانات کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ اس نظام حکومت میں ذات پات۔ رنگ و نسل اور عقیدے کے تمام امتیازات کو مٹا دیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں مسلم لیگی لیڈر ہر گھڑی یہ اعلان کرتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ کے اصولوں پر پاکستان ایک مذہبی نظامِ حکومت ہوگا۔ یہ تو سراسر نفرت انگیز اور رجعت پسندانہ اقدام ہے۔ گویا یہ سنہ ۱۹۵۰ء ایسے دورِ جدید میں کٹر مُلائیت قائم کی جا رہی ہے۔ ایک جمہوریت پرست اس قسم کے نظامِ حکومت کے ساتھ کس طرح وابستگی کا حامی ہو سکتا ہے۔ ایک غیر مسلم خاص کر ہندو ایسے ماحول میں رہنے کو کبھی تیار نہیں۔ مسلمانوں کو حق خود ارادیت دینا اچھی بات ہے۔ لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ وہ مذہبی جنون کے اثر میں آ کر غلط فیصلہ کریں گے۔ تو ہمارا فرض ہے کہ ان کو نیک و بد سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جائے۔

جواب ——— اب آپ نے بہت کمزور موقف کا سہارا لینا شروع کر دیا ہے۔ آپ کو یہ حق پہنچتا ہی کس طرح ہے کہ آپ خواہ مخواہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کی بہتری کی ذمہ داری سنبھالتے پھریں یہ تو کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانا ہے۔ آپ کو بتلا دیا گیا ہے کہ تجویز شدہ استصواب رائے عامہ کے وقت ہر فرد یا جماعت کی طرح آپ کو اپنے نظریات کے پرچار کا پورا موقعہ ملے گا۔ اگر آپ کا یہی خیال ہے۔ کہ ہندوستان ایک جمہوری۔ آسودہ حال اور ترقی پسند نظام حکومت ہے اور اس کے برعکس پاکستان ایک خالص مذہبی ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس نظریہ کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر کے کشمیری عوام کے روبرو پیش کرنے کی آپ کو مکمل اجازت ہوگی۔ پروپیگنڈے کی وہ تمام مراعات جو ہر فریق کو حاصل ہوں گی۔ آپ بھی دلائل سے قائل کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے دلیل اور جمہوریت کش مطالبہ ہے۔ کہ کشمیری عوام کو محض اس لئے حق خود ارادیت سے محروم کر دیا جائے۔ کہ ان کا مذہبی اپیل کی رَو میں بہہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ان کو زبردستی ایک ترقی خواہ اور جمہوری حکومت کا غلام بنا دینا چاہیئے۔ ہر جماعت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مطمح نظر اور سیاسی عقیدے کا کھلم کھلا پرچار کرے باقی رہا اپنے مستقبل کا فیصلہ تو وہ صرف کشمیری عوام ہی کر سکتے ہیں۔ خواہ یہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے جمہوریت کے بنیادی اصول کا صحیح مدعا۔ جن پر میں آج تک قائم ہوں۔

آپ کے سوال کا پورا جواب دینے سے پہلے دو چیزوں کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اوّل یہ کہ وادی کشمیر میں آج کل ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ کہ وہاں اس وقت کوئی جماعت پاکستان کی حمایت میں پراپیگنڈہ نہیں کر سکتی اس کے برعکس ہندوستان کے حامی نیشنلسٹوں کو کھلی چھٹی ملی ہے پچھلے تین سالوں سے وہ اپنے خیالات کا علانیہ پرچار کر رہے ہیں۔ حکومت کا سارا نظم و نسق ان کے قبضہ میں ہے۔ وہ مخالف فریق کی آواز کو جبر سے دبائے ہوئے ہیں۔ گورنمنٹ کی یہ ساری مشینری شاید استصواب رائے عامہ تک ان کے ہی ہاتھ میں رہے۔ لہٰذا آپ کو یقین کرنا چاہیئے کہ اس وقت پاکستان چاہنے والوں کے خلاف تمام دشمن عناصر کا پلڑا بھاری ہے۔

دوم آپ کہتے ہیں کہ کشمیری عوام ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ بالکل بے معنی اور بے تکی سی بات ہے۔ یہ نظریہ کانگرسی منطق و فلسفہ کے بھی خلاف ہے۔ ذرا سوچیں تو سہی کہ آج سے تین برس پہلے یعنی آزادی کے اعلان کے وقت اگر ہندوستانیوں کو یہ کہا جاتا کہ آپ ابھی آزادی کے اہل نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ کی اکثریت جاہل اور پس ماندہ ہے۔ لہٰذا ابھی آپ کو انگریزی سامراج کی سرداری میں رہنا چاہیئے تو کیا کوئی غیرت مند قوم پرست یہ دلیل ماننے کو تیار ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب دیانت داری کا تقاضا ہے کہ نفی میں ہوگا۔ پس اس روشنی کے زمانے میں کوئی بھی عقلمند شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں ملک کو آزادی نہ دی جائے۔ کیونکہ وہاں کے لوگ اَن پڑھ اور پسماندہ ہیں۔ آزادی تو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی عذر کی

آزادی کو یہ حق چھین نہیں سکتی۔ ویسے بھی ایک عام کشمیری سیاسی تربیت اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ایک عام ہندوستانی سے زیادہ بیدار مغز واقع ہوا ہے۔ اور اچھے برے میں پوری تمیز کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ بھی پاکستان کے حامی کارکنوں کے مذہبی نعرہ سے خائف نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ بھی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اگر یہی نعرہ ہندوستان کے ساتھ الحاق میں معاون ثابت ہوا تو کوئی بھی قوم پرست اس کو برا محسوس نہیں کریگا۔ خود کشمیری نیشنلسٹ مسلمان ریاست کے مسلمانوں کو مذہب کے نام پر ابھارتے رہے ہیں۔ مگر کسی نے محض اس لئے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ خوب حوصلہ افزائی کی۔ کہ اس سے گاندھی جی کی قوم پرستی کو تقویت پہنچتی تھی۔ لیکن مذہب کے نام کی اپیل جب ان کے مفاد سے ٹکراتی ہے۔ تو فرقہ وارانہ جنون اور قابل ملامت بن جاتی ہے۔ ایں چہ بوالعجبی است

اب میں آپ کے دو اہم نکات کا جائزہ لیتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں ایک لادینی حکومت کا نظام قائم ہے۔ اور پاکستان ایک مذہبی ریاست ہے۔ آپ کا یہ عقیدہ تمام مذہبی قوم پرستوں کی طرح بڑا راسخ ہو گیا ہے۔ لیکن میں اس چیز کو ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ کہ ہندوستان ایک غیر مذہبی اور جمہوری ریاست ہے۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتا کہ یہ حکومت روشن خیال ہی ہے۔ ایک عام ہندوستانی کی حالت واقعی قابل رحم ہے کہ کانگریس پریس اور راہنماؤں نے اپنے موثر پراپیگنڈے سے اس کی سوچ بچار اور تمیز کرنے کی قوت کو سلب کر دیا ہے۔ اور بیچارہ وہ اپنے ذہن سے کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ بہرحال ایک حقیقت پسند انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ بڑے بڑے لیڈروں کے بیانات کو جوں کا توں مان لینے کی بجائے ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اور بلا پس و پیش کسی بات کو تسلیم کرنے سے پہلے اس کی پوری چھان بین کرے۔ کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں وہ کر کے بھی دکھاتے ہیں یا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر شخص اس امر میں مجھ سے اتفاق کرے گا۔ کہ ان لوگوں کے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی ہے۔ ان کی تقریریں کھوکھلی اور بے وقعت ہوتی ہیں۔ کسی فرد، گروہ، طبقہ، جماعت اور قوم کو اس کے کردار سے پرکھا جاتا ہے۔ زبانی دعوے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔

اس بات کا بھی ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے کہ کانگریس بھی ایسا جمہوری ادارہ ہے جو بلا امتیاز مذہب و ملت سب کی آزادی کا ضامن ہے۔ اور یہ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سے بلحاظ عقیدہ ایک مختلف تنظیم ہے۔ لیکن وہ لوگ جو سطح بین نہیں ہوتے بلکہ گہرائی میں اترنے کے عادی ہیں۔ جلدی بھانپ سکتے ہیں کہ کردار و عمل کے لحاظ سے کانگریس اور ہندو مہا سبھا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے اعلانات کے باوجود کانگریس کا مقصد بھی ہندو تہذیب کا احیا ہی ہوتا ہے۔ اور سارے ہیر پھیر کے بعد بات وہیں فرقہ پرستی پر آکر پڑتی ہے۔ اگر کانگریس نیک نیتی اور عزم کے ساتھ متحدہ قومیت کے پرچم کو بلند کئے رکھتی تو پاکستان کبھی نہ بنتا اور ہندوستان آج ایک ہوتا۔ فی الحقیقت مسلم لیگ کو بھی کبھی عروج حاصل نہ ہوتا۔ اور نہ ہی جناح صاحب کا وہ قومی نظریہ اتنا جاذب اثر ہوتا۔ یہ کانگریس کی کارستانیاں ہیں۔ جو گاندھی جی کی قیادت میں پھلنے اور ہندو فرقہ پرست جماعتوں کی حریف ہونے کے باوجود ایسے ایسے پینترے بدلتی رہی ہے۔ کہ جن کی وجہ سے مہا سبھائی ہندوؤں میں تو یہ کافی ہر دلعزیز ہوتی گئی مگر غیر ہندو لوگ آہستہ آہستہ اس سے دور ہٹتے گئے۔ حتیٰ کہ یہ عظیم الشان اور پرشکوہ جمہوری ادارہ ایک فرقہ پرست ٹولی بن کر اپنی ساری انقلابی اور قومی سیرت کھو بیٹھا۔

ذرا سارے ہندوستان پر نظر دوڑائیے اور مشاہدہ کیجئے کہ آزادی کے ان تین سالوں میں اس نے کون سی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ سوائے ان متواتر اعلانات کے کہ ہندوستان ایک غیر مذہبی جمہوریت ہے ترقی و عروج کی کوئی نشانی نظر نہیں آئے گی۔ تہذیبی لحاظ سے یہی بڑا کارنامہ ہے کہ ساری کوششیں قدیم اور رجعت پسندانہ براہمن ازم کو زندہ کرنے کیلئے وقف کی جا رہی ہیں۔ غیر ہندو لوگ خاص کر مسلمان ڈرا دھمکا کر مجبور کئے جاتے ہیں کہ وہ اس براہمنی تمدن کو اختیار کریں۔ ورنہ اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ ہندی جس کو ملک کے تیس فیصدی باشندے بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے دیوناگری حروف میں قومی زبان قرار دی گئی ہے۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ اس مردہ زبان کو لاکھوں ہندو بھی نہیں سمجھتے۔ شمالی اور وسطی ہندوستان میں تمام لوگ جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ صرف فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندوستانی جانتے ہیں۔ ہندوؤں کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبارات اردو میں ہوتے ہیں۔ اس زندہ اور رسیلی زبان کو محض اس واسطے مٹایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت کی یادگار ہے۔ حالانکہ ہندوؤں نے بھی اس کی ترویج میں پورا حصہ لیا ہے۔ اور ہندو مصنفوں کے ادب عالیہ کے بہترین نمونوں سے اردو زبان مالا مال ہے۔ بہار۔ یوپی۔ راجستھان اور سی پی میں جہاں اردو زبان صدیوں سے پھلتی پھولتی چلی آ رہی تھی اسے ترک کر کے ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اور سکولوں میں ذریعہ تعلیم بھی اس کو قرار دیا گیا ہے۔ صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ بلکہ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر اور صوبوں کے مہامنتری اور گورنر تک اس کوشش میں ہیں کہ سنسکرت بھارت کی قومی زبان قرار دی جانی چاہیئے کیونکہ یہی پراچین ہندو سبھیتا کی مخزن ہے۔

ٹیگور کا گیت "جانا گانا مانا" اور بنکم چندر کا "بندے ماترم" ہندوستان کے قومی ترانے کی حیثیت سے رسمی قرار دئیے گئے ہیں۔ ایک عام ہندوستانی کے لئے خواہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ یہ دونوں ناقابل فہم ہیں۔ چونکہ وہ دونوں اول الذکر سنسکرت آمیز بنگالی میں ہے۔ سنسکرت میں ہیں اس لئے بطور عقیدت ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ کئی سالوں تک ان کے ساتھ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کا مشہور ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کانگریس پیش کرتی رہی ہے۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد اس کو قوم پرستوں کے حلقہ میں گانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اردو میں ہے۔ یہ ترانہ "بندے ماترم" اور "جانا گانا مانا" سے زیادہ آسان بھی ہے اور بے حد شیریں۔ رسیلا اور لطافت سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو خارج کر دیا گیا ہے۔

گاؤکشی کو سارے ہندوستان میں آہستہ آہستہ بند کیا جا رہا ہے آئین ساز اسمبلی نے اس کو صوبوں کے نام "ہدایت نامہ" میں شامل کر لیا ہے۔ تاکہ یہ بالکل ممنوع قرار دی جا سکے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے نہیں کہ اس سے کوئی اقتصادی بہتری وابستہ ہے۔ نہیں! بلکہ اس لئے کہ ہندو اپنے دھرم شاستر کے مطابق گائے ماتا کو متبرک مانتے ہیں۔ اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔

کیا ایک غیر مذہبی جمہوریہ کے یہی مبادیات ہیں؟ جس وقت پنڈت جواہر لعل نہرو نے آزاد ہندوستان کے پردھان منتری کی گدی ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو سنبھالی تو یہ ساری رسم آدھی رات کے وقت ادا کی گئی۔ کیونکہ ہندو جوتشیوں نے مہورت میں یہی وقت نکالا تھا۔ براہمن اس شبھ گھڑی شاستروں میں دی ہوئی تمام رسومات پوری کرنے کے لئے موجود تھے۔ اس کے بعد بھی بہت قدر تقاریب منائی گئیں۔ نہرو جی نے ساری مذہبی رسمیں ساتھ ساتھ پوری کیں۔ دوسرے کانگرسی وزراء نے بھی وہ خواہ مرکز کے تھے یا صوبائی۔ پردھان منتری کی پیروی کی۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ یکم مئی ۱۹۵۰ء کو یو۔ پی کے چیف منسٹر نے بنارس کی میونسپل گراؤنڈ میں ایک ایسے مندر کی رسم افتتاح فرمائی ہے کہ جس میں مہاتما گاندھی اور کستوربا کے مرمریں بت رکھے گئے ہیں۔ یہ "ڈنڈی مارچ" کی یاد کے انداز میں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے کئی ایک مقامات پر مہاتما گاندھی کی مورتیاں نصب کی گئی ہیں۔ اور ہر جگہ مذہبی رسوم کو کچھ ایسے انداز کے ساتھ ادا کیا گیا ہے گویا یہ ملک کی سیاسی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہیں۔ اور آزادی ملنے کے بعد سرکاری طور سے ان پر عمل کرنا لازمی ہے۔ کیا ہندوستان کے غیر مذہبی ہونے کے یہی عنوان ہیں؟

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان تمام طبقوں یعنی ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کے ملاپ سے ایک مشترک قومیت کو جنم دے رہا ہے۔ اور فرقہ پرستی ختم ہو رہی ہے۔ اور اس کو ہندوستان کے غیر مذہبی ہونے کا ثبوت بھی سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ عملی طور پر جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ وہ صرف بجائے مسلمان کی آواز کو دبایا جا رہا ہے۔ کیونکہ صرف مسلمان ہی ان کے خیال میں فرقہ پرست ہیں۔ جب ہندو فرقہ پرستی کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو کانگرسی حکومت اور کانگرسی اراکین چپ سادھ لیتے ہیں۔ اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے تعلیمی ادارے جو کسی خاص فرقے کے نام سے منسوب ہوں۔ ہندوستان میں نہیں ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ہندو یونیورسٹی بنارس اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو حکم دیا گیا۔ کہ وہ اپنے نام کے پہلے لفظ "ہندو" اور "مسلم" کو آئندہ ترک کر دیں۔ مسلم یونیورسٹی والے ابھی کوئی فیصلہ کرنے ہی نہ پائے تھے کہ ہندو یونیورسٹی کے چلانے والوں نے جو پکے قوم پرست ہیں اس حکم کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا۔ مرکزی حکومت نے ایک قرارداد منظور کی کہ ہندوستان میں کسی فرقہ وارانہ سیاسی جماعت کے وجود کو برداشت نہیں کیا جائیگا اور حکومت ایسی جماعتوں کو ختم کر کے دم لیگی لیکن ہندو مہاسبھا۔ اکالی دل اور شیڈول کاسٹ ایسوسی ایشن نے اپنی تنظیموں کو ختم کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ حکومت کو آخر یہ زہر کھانا ہی پڑا۔ ابھی اس وقت جبکہ احکام کی سیاہی خشک بھی نہ ہوئی تھی۔ تمام صوبوں میں مسلمانوں

کی درس گاہیں جبراً بند کر دی گئیں۔ مغربی بنگال میں اسلامیہ کالج کلکتہ کو سنٹرل کلکتہ کالج بنا دیا گیا۔ لیکن خالص ہندو تعلیمی ادارے مثلاً ودیا ساگر کالج جوں کے توں موجود ہیں۔ یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں ہے کیونکہ کانگرس جو کہ معنوی لحاظ سے مہاسبھائی جماعت ہے۔ لیکن قوم پرستی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ تمام ہندو اداروں سے ایک طرح کا روحانی انس ہے۔ لہٰذا یہ ان کی کبھی بدخواہ نہیں ہو سکتی۔

مومن کانفرنس۔ آزاد مسلم کانفرنس اور جمعیت علمائے ہند ایسی جماعتیں جو کانگرس کی حمایت کرتی ہیں چھوڑ کر باقی تمام غیر ہندو خصوصاً مسلم ادارے جو کہ کانگرس کے مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ سخت نفرت اور معاندانہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اگر مذہبی اداروں اور یکی قوم پرستی کا یہ مطلب ہے کہ حکومت اور سیاست مذہبی تعصب سے مبرا ہو تو پھر یہ آج ہندوستان میں ناپید ہے۔

بھارت کے ہندو خواہ وہ کسی خیال کے ہوں۔ عام طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پاکستان ایک مذہبی نظامِ حکومت ہے لہٰذا اس میں غیر مسلم اقلیت کے ساتھ ایک جیسا سلوک ناممکن ہے۔ اور ہر قسم کے حقوق غیر محفوظ ہیں یہ اعتراض کچھ اس قدر عام ہو چکا ہے کہ بہت سے لوگ اس کو سچ مچ امر واقعہ ہی سمجھ چکے ہیں۔ آیئے ذرا ہم سوجھ بوجھ سے کام لے کر اس معاملہ کی چھان بین کریں۔ تاریخ میں ایک مذہبی حکومت ایسا نظامِ حکومت ہے۔ جس کو مذہبی رہنما خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے چلاتے ہیں۔ اگر اس تعریف کو صحیح مان لیا جائے تو کوئی بھی عقلمند انسان بلا سوچے سمجھے پاکستان کو مذہبی نظامِ حکومت نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت پاکستان میں عوام کے چنے ہوئے نمائندے حکومت کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح نمائندے نہیں کہلائے جا سکتے۔ کیونکہ ان کا طرزِ انتخاب غیر جمہوری اور محدود تھا۔ یاد رہے کہ یہی صورتِ حال ہندوستان میں بھی ہے یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں نئے آئین کے مطابق رسمی جمہوریت کے پیش نظر ہر بالغ کو رائے دہندگی کا حق دے دیا گیا ہے۔ مگر پاکستان بھی نئے آئین کی تشکیل میں مصروف ہے۔ اور پاکستانی لیڈروں کا بیان ہے کہ یہ آئین ہندوستانی آئین سے مختلف نہیں ہوگا۔

جہاں تک اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا تعلق ہے۔ ہم مسٹر لیاقت علی پرائم منسٹر پاکستان کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہیں:-

"[illegible] ہر پاکستانی بلا امتیازِ مذہب و ملت مساوی حقوق اور یکساں مراعات کا پورا حق دار ہے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے اپنی قراردادِ مقاصد میں اس کی پوری تشریح کر دی ہے چند غیر مسلم جو کہ پاکستان کے دشمن ہیں یہ کہتے ہیں کہ چونکہ پاکستانی لیڈر پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہیں اس لئے کوئی غیر مسلم اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ اس پراپیگنڈے سے بڑھ کر کوئی گمراہ کن سفید جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنی تقریروں میں بار بار کہا ہے کہ ہم پاکستان کی تعمیر اسلامی مساوات۔ اخوت اور معاشری عدل کے اصول پر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسے سماجی نظام کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں ہر شخص خواہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، نہ صرف اپنے حقِ محنت سے مستفید ہوگا بلکہ اسے اس امر

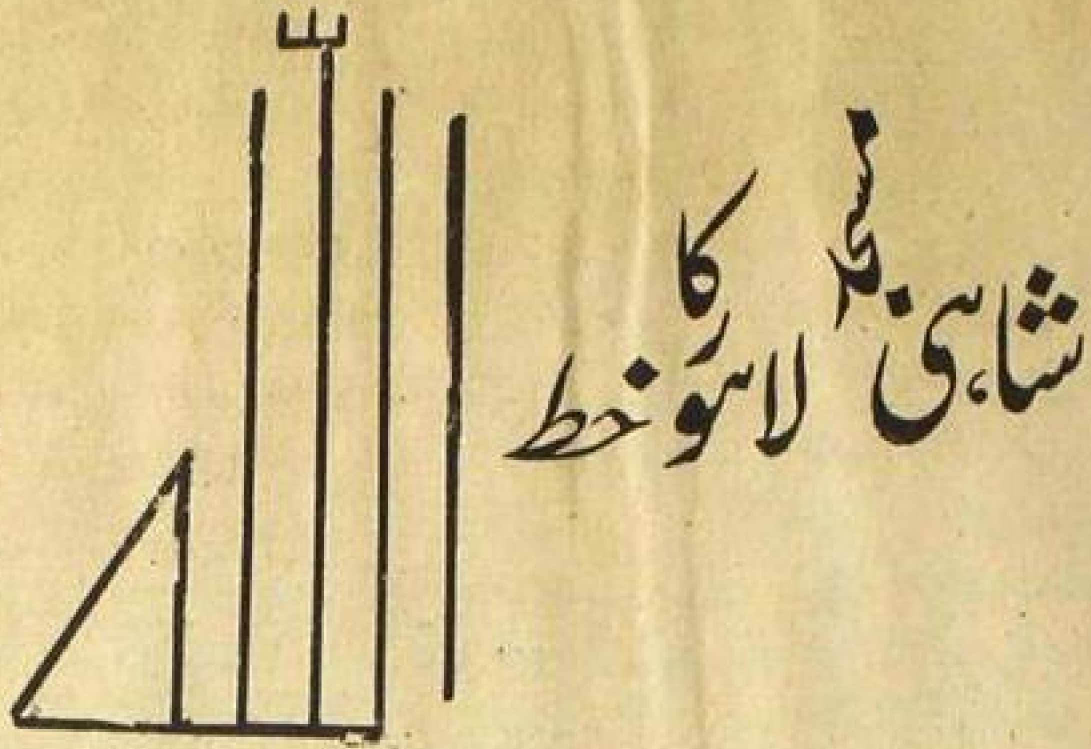
کا بھی اطمینان حاصل ہو گا کہ اس نظام میں اس کے ساتھ ہر حالت میں پورا انصاف کیا جائیگا۔ اس معاشری ادارے میں ہر شخص کو ہر قسم کے حقوق مساوی حاصل ہوں گے۔ پاکستان کی اقلیتیں تمام حقوق اور مراعات کی ایسے ہی مستحق ہوں گی جیسے دوسرے پاکستانی طبقے ہیں اقلیتوں کی حفاظت اور ان کی معاشرت کی ترقی و فلاح ہمارا مقدس فرض ہے۔"

پراپیگنڈا اسسٹنٹ کہ گر اس اعلان کو رد کر دیا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان کی صورت میں بھی ایسا ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم دونوں حکومتوں کا جائزہ ان کے راہنماؤں کے اعلانات سے ہی لے رہے ہیں۔ ہندو سیاست دان یہ غلط سوچتے ہیں کہ ہندوستان ایک لادینی ریاست ہے اور پاکستان ایک مذہبی نظامِ حکومت ہے۔ پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں پاکستان ایسا ہی مذہبی نظامِ حکومت ہے جیسا کہ ہندوستان ایک غیر مذہبی نظام ہے۔ ایک حکومت اس وقت واقعی مذہبی ہوتی ہے جب اس کی سیاسی باگ ڈور دینی علماء اور راہنماؤں کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن یہ صورت نہ ہی پاکستان میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی ہندوستان میں۔ ساتھ ہی یہ دونوں حکومتیں غیر مذہبی بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ لادینی اور کلیسائی نظام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب تک عوام کا تمدنی معیار بے حد بلند نہ کیا جائے تب تک ایک صحیح لادینی نظامِ حکومت قائم کرنا مشکل ہے۔ لیڈروں کے یہ سب تصورات لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ہیں تاکہ یہ اپنے ووٹروں میں مقبول اور ہر دلعزیز بنے رہیں۔ ہندو اور مسلمان عوام یہی چاہتے ہیں کہ ان کے رہنما کٹر مذہب پرست ثابت ہوں۔ اور تمام مذہبی رسوم خواہ کتنی ہی غیر عقلی اور توہم پرستانہ ہوں ہر لیڈر کو انہیں آنکھیں بند کر کے پورا کرنا چاہیئے۔ جب تک ایک رہنما مخالفت اور غیر مقبولیت کے خوف سے بے نیاز ہو کر غیر مذہبی نظامِ سیاست کو روشناس کرانے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ تب تک یہ نظام اپنے صحیح خد و خال میں قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لحاظ سے ایسا کرنے کی اخلاقی جرأت نہ ہی کانگرسی لیڈروں میں ہے اور نہ لیگیوں میں۔ اس لئے دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ دونوں اپنی اپنی حکومت کو مذہب پرست بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستانی کھلم کھلا اور اعلانیہ کر رہے ہیں مگر بھارت کے حکمران درپردہ اس کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر بظاہر وہ غیر مذہبیت کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ یہ سراسر فریب کاری ہے۔

آپ نے پاکستان کے اس اعلان پر کہ یہ ایک اسلامی حکومت ہو گی۔ بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن آپ بھول گئے ہیں کہ ہر ایک کانگرسی مہاتما گاندھی سے لے کر ایک معمولی کارکن تک دنیا کو یہی بتاتے رہے ہیں کہ ان کا آدرش ہندوستان میں رام راج قائم کرنا ہے۔ میری التجا ہے کہ آپ ہی بتائیے اس میں فرق کیا ہے۔ اگر صرف کسی جدید طرز کی حکومت کے ساتھ لفظ اسلام ہی آپ کے اشتعال کا باعث ہے تو لفظ رام راج کیوں نہیں ہے؟ یہ بھی ایک طرح کی مذہب پرستی اور قدامت پسندی ہے۔ اگر رام راج قائم کرنے کی تمنا کے ساتھ کانگرسی لوگ غیر مذہبی نظامِ حکومت، جمہوریت اور متحدہ قومیت کا بھی خواب دیکھ سکتے ہیں تو لیگی راہنماؤں کو بھی ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ بھی تو ہزار بار کہتے ہیں کہ وہ اپنے ملک میں ایسی جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں ہر مسلمان اور غیر مسلمان کو زندگی کے ہر شعبہ میں مساوی حقوق اور مساوی سہولتیں میسر ہوں گی۔ اگر ایک پکا جمہوریت پرست ہندوستان میں زندگی بسر کر سکتا ہے تو وہ پاکستان میں بھی پورے اطمینان سے زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان ہندوستان میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا تو ایک ہندو کو بھی پاکستان میں اپنا جیون بنانے میں کوئی دقت اور خوف محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔

سوال —————— اگر آپ کا یہی خیال ہے کہ بھارت ایک خالص ہندو راج اور پاکستان ایک مسلم حکومت بن رہا ہے اس لئے کشمیر جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے تو اس صورت میں کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ ریاست کے لاکھوں ہندو باشندوں کے ساتھ ظلم ہو گا۔ اگر مسلمان ہندو مرکز کی سرداری قبول نہیں کر سکتے تو پھر ہندو اسلامی مرکز کی سرداری کیوں قبول کریں۔ اس گتھی کو آپ کیسے سلجھائیں گے۔

جواب —————— آپ کا اعتراض واقعی معقول ہے درحقیقت تقسیم ہند نے اقلیتوں کا مسئلہ حل ہی نہیں کیا بلکہ ایک لحاظ سے یہ اور اُلجھ گیا ہے۔ تمام جمہوریت پرست عناصر نے جن میں ہم بھی شامل تھے آئندہ ان ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کرتے ہوئے فرقہ وار بنیادوں پر ملکی تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ لیکن گاندھیائی قوم پرستی کے کردار نے مسلمانوں میں ایسا ردِعمل پیدا کر دیا اور حالات ایسے مرحلے پر پہنچ گئے کہ سوائے تقسیم کو ماننے کے کوئی چارہ نہ رہا یہ ہمارا قصور نہیں ہے اور تاریخ میں جو کچھ ہو چکا ہے اس پر پیچ و تاب کھانا اب بے فائدہ ہے۔ اب ہمارے سامنے ایسی صورتِ حال موجود ہے کہ جس سے پچھلی غلطی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں اکثریت کے مفاد کا زیادہ سے زیادہ احترام کرنا چاہیئے ریاست کی پاکستان کے ساتھ شمولیت میرے خیال میں مسلمانوں کو مقابلتاً زیادہ خوش اور مطمئن کر سکے گی۔ اب رہ گیا اقلیتوں کا مسئلہ۔ سو اگر ساری ریاست پاکستان کے ساتھ ملحق ہو گی۔ تو زیادہ خوش حالی اور ترقی کا باعث ہو گا۔ لیکن ان اسباب سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جن کی بنا پر صوبہ جموں کے ڈوگرہ ہندو پاکستان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ان ہندوؤں کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ صوبہ جموں کے وہ علاقے جہاں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے بھارت کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ جس طرح ہم صوبہ کشمیر کے مسلمانوں کے حق میں دلائل دے چکے ہیں اسی طرح ہمیں ان غیر مسلموں کو حق خود ارادیت دینے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ حکومت پاکستان نے اگر ڈوگرہ ہندوؤں کو ان کا یہ حق نہ دیا تو یہ اپنا موقف کمزور کر لے گی گویا اپنی حمایت میں جو دلائل اس نے اب تک پیش کئے ہیں۔ ان کی خود ہی تردید کر رہی ہے۔ باقی رہا وادیٔ کشمیر کے ہندوؤں اور سکھوں کا معاملہ۔ تو ان کے لئے ایسی سہولتیں اور موافق ماحول پیدا کر دیا جائے۔ تاکہ یہ لوگ الحاقِ پاکستان کے بعد اپنے وطن میں پُر امن اور آبرومندانہ زندگی بسر کر سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی چند سالوں تک پاکستان اور بھارت میں اقلیتوں کی زندگی کٹھن رہے گی۔ یہ ماضی کے تلخ حقائق کی پیداوار ہے۔



# شاہی مسجد لاہور کا خط میاں کے نام

**یاربّ کعبہ!** میں ایک دکھیاری لڑکی ہوں۔ تو علام الغیب ہے، تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد میں نے کچھ کہنا چاہا ہے۔ میرے احساسات حد درجہ مجروح ہیں، لیکن یہ الفاظ ان زخموں کی روئیداد نہیں کہہ سکتے۔ یہ زیادہ سے زیادہ مرہم ہیں یا پٹی!

میرا رنگ و روغن جو اکھڑ چکا ہے، اب اسے دو سو سال کی گردش کے بعد غازے کا سہارا دیا جا رہا ہے۔ میرے ظواہر کی آرائش ہو رہی ہے، میری جھریوں کی کایا پلٹ کے لیے شبانہ روز محنت سے کام لیا جا رہا ہے لیکن میرا اضطراب جوں کا توں ہے۔ میرا کرب انگاروں سے زیادہ تیز اور تلواروں سے زیادہ بے باک ہے۔

میں کعبۃ اللہ کی بیٹی ہوں!

چند چہیتی اور نامور بیٹیوں میں سے ایک، لیکن دور افتادہ بیٹی جس کی آبرو، تھکی ہوئی اذانوں سے بوجھل اور گرد و پیش کی تماشائی تنہائیوں سے مضمحل ہے۔ میں چوراہے میں پڑی ہوئی لاش ہوں، برہنہ لاش!

لیکن اس پر گدھ، شرعی گدھ منڈلا رہے ہیں اور جنسی کتے اس کی ہڈیاں جھنجھوڑ رہے ہیں، میرا گوشت ہر زبان کا ذائقہ ہے، میری ہڈیاں ان دھنوں کے ساتھ چٹختی ہیں جنہیں رات کا بھنورا، آوازادیوں کے ہونٹوں سے اس طرح کھینچتا ہے جس طرح اکثر دیہاتی گنے کی پوروں سے رس چوستے ہیں یا بے درد فرمانروا رعیت کی بیٹیوں کا لہو چاٹتے ہیں۔ میں نے اپنا کاجل ان غزالوں میں بانٹ دیا ہے، جن کی پیٹھ وقت کے تازیانوں سے معصیت کی ایک کھلی دستاویز ہے۔ میرا خرمن عفت کی ان ہی قبروں کا غازۂ شب تاب ہے اور میرے یہ سفید گنبد رات کی الناک برہنگی کا سفید کفن، جن پر کبھی گھلا اندھیرا چھا جاتا ہے اور کبھی چاند کا فانوس محیط ہو کر ستاروں کی شمعیں جلاتا ہے۔ پھر کبھی چودھویں کا چاند میری برہنگی کا تماشا کرتے ہوئے، چپ چاپ دور نکل جاتا ہے ——

میں سال ہا سال سے لیل و نہار کے ان گنت تھپیڑوں کے ساتھ یہیں چپ چاپ بیٹھی ہوں۔ میں نے تاریخ کے ہر موڑ کی ضربیں سہی ہیں۔ میں نے سہاگ رات بھی دیکھی ہے۔ میری عروسی کا جشن تاریخ کی دلآویز فصل تھا۔ اعلیٰ حضرت محی الدین اورنگ زیب نے نیو اٹھائی، سولہ سنگھار کیا، تکبیریں گونجیں، اللہ کی عظمت کا اعتراف کیا گیا۔ قلعہ کے پٹ کھلے، تو جن کے آستانۂ جبروت پر وقت کی پیشانیاں اور فرمانروائیاں جھکتی تھیں۔ وہ سجدہ ہائے عجز و نیاز لے کر حاضر ہوئے۔ مؤذن نے پکارا، نیکی نے آواز دی، فلاح نے تعاقب کیا۔ صلوٰۃ کی پیشوائی کو بندگانِ عالی مقام آپہنچے اور ختم المرسلینؐ کے پرچم کو آنچل بنا لیا۔ یہ میرا سولہ سنگھار تھا۔

پھر، یہ سورج ڈوب گیا۔ وقت کبھی بانکے چھکیت کی طرح تماشا بنتا رہا، کبھی شاعر کے خیال کی طرح تیزی سے پلٹتا رہا، کبھی ہجر کی نبضوں میں ڈوب گیا اور کبھی ان دنوں کی طرح بے تاب ہو گیا۔ جن دنوں اورنگ زیب اپنے فقیہانہ تشقف کے باوصف شراب کے جام بھر بھر کر پیش کرتا اور اس مینائے سرو قامت کے عالم نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا تھا۔

میرا شباب ڈھلنے لگا، میری رعنائیاں بیوہ کا سہاگ بن گئیں، میری نورانی آنکھوں سے قبروں کے خلا جھانکنے لگے۔ میرا سرخ و سفید چہرہ اس تماشائی عورت کی طرح پیلا پڑ گیا، جس کی امرتیاں گنہگار ہاتھوں کے تھپیڑوں سے سوکھ کر خشک جاتی ہیں —— میرا وجود جو کچھ دنوں پہلے قرآن کی ایک سورۃ تھا، اب گئے وقتوں کی ایک ہچکی رہ گیا ہے۔ میں اوباشوں کے نرغے میں آگئی، حتیٰ کہ میں ایک کتبہ رہ گئی، جس پر کندہ تھا۔ ؎

اورنگ زیبؒ کی یادگار
سیاحوں کے شوق کی مہمیز"

رات آ پہنچی، سطوتِ شاہی نے رختِ سفر باندھا، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ذرخواروں نے شب بسریوں کے لیے میرے گرد و پیش کو چن لیا اور میں سورماؤں کے گھوڑوں کا اصطبل بن گئی، موت نے نقاب اٹھائی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ میری پائنتی کی طرف ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ وقت نے پھر پہلو بدلا۔ اذانوں نے اپنی ہی خاکستر سے جلا پائی۔ صلوٰۃ کو سہارا ملا اور مسجدوں نے سکھ کا سانس لیا۔ میں نے مانگے تانگے کا جوڑا پہن لیا۔

زمانہ رقاصہ کے زاویوں کی طرح بدلتا رہا، لیل و نہار غزل کے ہر شعر کی طرح مختلف الاحوال ہوتے گئے، اس

# جس مملکت کا آغاز لاالہ الا اللہ سے ہوا، اب اسکی پیشانی پر فاعتبرو یا اولی الابصار لکھا ہوا ہے

صدی کے نصف اول تک آہ و سرد کی طرح خاموش رہی، کبھی کبھار وقت کی پلکوں پر آنسوؤں کی طرح جھلملائی ——

لیکن نصف صدی میں میرے دن لہلہا اٹھے، میری راتیں مہک گئیں، میری محرابوں اور پیشانی ان دلہنوں کی طرح روشن ہو گئی، جن کی امیدیں نورانی خوابوں سے جھلک اٹھتی ہیں اور جن کی حیا پر ملائکہ شہادت دیتے ہیں۔ میرا منبر ایک گود بن گیا، ماں کی گود، بہن کی گود، بیٹی کی گود کہ ان گودوں میں قرآن کے اوراق پرورش پاتے ہیں۔ یہ قرمزی محرابیں اور یہ سفید گنبد جانتے ہیں کہ ان کا سینہ نعرہ ہائے رستاخیز کا امانت کدہ ہے۔ یہ لبیں چپ چاپ یہ محرابیں مہر بلب! لیکن انہیں حشر سے پہلے بھی کوئی شیشہ جگا سکتا ہے۔

ان کے ہونٹ اب بھی ہل رہے ہیں۔ ان میں اللہ کا الہام پیوست ہے۔ بچھڑ لول رہے ہیں۔

ع ابھی اس راہ سے گیا ہے کوئی

اور وہ سامنے کھلا دروازہ کہہ رہا ہے۔

ع ہائے وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

اور پھر اس طرف ان حجروں کے طاق پر روشنی کے چراغ ابوالکلام آزادؒ کی حکایت کی مانند تھک کر بجھ چکے ہیں اور حکیم الامتؒ کے گداز کی طرح حسرت شکایت الاپ رہے ہیں۔

تاریخ کروٹ لے رہی ہے۔ سانپ کینچلی اتار رہا ہے۔ شاعر مطلع سے مقطع تک آ پہنچا ہے۔ دلہن سسرال سے میکے جا رہی ہے۔ محبت، ہجر کی سرحد پر وصال کا دم لائیے دیکھ رہی ہے۔ کرن کے ماتھے سے افشاں اتر چکی ہے اور کسی رہگذر کہانی کا تمت بالخیر ہے۔

پاکستان بن گیا۔

لاالٰہ الا اللہ کی عملی تفسیر ہاتھ آگئی۔ ہزاروں عصمتیں دے کر، ایک عصمت کی بنیاد رکھی گئی۔ سوا سو برس کی پرانی غلامی نے انتقال کیا۔ "اوامر" نے علم کھولے۔ "نواہی" کا وقت آخر آ گیا۔

اذانوں میں توانائی اور تکبیروں میں رعنائی کا گمان ہونے لگا۔ دل آئینہ ہو گئے، چہرے بشاش، لیکن ایکا ایکی آرزوؤں نے ٹوٹنا شروع کر دیا۔ مونیا مرجھانے لگی، ایک ایک کلی جھڑ گئی، پورا باغ ویرانہ بن گیا۔

جس مملکت کا آغاز "لاالٰہ الا اللہ" پر تھا، اس کے ماتھے پر "فاعتبرو یا اولی الابصار" چسپاں ہوا، میرا گرد و پیش پورے معاشرے کا گرد و پیش بن گیا۔

میں کعبہ کی بیٹی ہوں، اے رب ذوالجلال! سنگ وخشت کی یادگار لیکن میرے حاشیے کی کائناتی وسعت پر خون کے بے شمار دھبے ہیں۔

ہم سب کے پالنہار! تو عرش پر ہے، تو فرش پر آ!
ان تکبیروں سے فائدہ؟ جو تجھے پکار نہیں سکتیں!
ان نمازوں کا نتیجہ؟ جو تجھے بلا نہیں سکتیں!
ان اذانوں کا ماحاصل؟ جو تجھے جگا نہیں سکتیں!

اے رب! میں کعبہ کی بیٹی ہوں، اس سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور پانچویں بڑی مملکت میں اورنگزیبؒ کی بیٹی زیب النساء کی ایک جان بار سہیلی!

میرا اور پڑا فقیہہ شہر کی دستار فضیلت ہے۔ میرا آنچل فرمانرواؤں کی شب بسریوں کا پردہ ہے۔ میرے گھٹے ہیٹے سفید گنبد میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ کی دردناک چیخیں منجمد ہیں۔ میں حمزہؓ کی فریاد اور حفظہؓ کے آنسو ہوں۔ میں وہ حدیث ہوں جو حضرت عائشہؓ سے عورتوں کے باب میں مروی ہے۔ میں ازواج مطہراتؓ کی مقدس یادوں کا سرورق ہوں —— میرا دل بنات طاہراتؓ کا آئینہ ہے۔ میں یزید کے دربار میں برہنہ سر زینبؓ کی صدائے احتجاج ہوں۔ میں ام کلثوم کا نوحہ اور اسماءؓ کا شکیب ہوں۔

یا حی یا قیوم! یہ سرخ سلیں فاطمۃ الزہرہؓ سے حیا مانگتے، مانگتے اندھی ہو گئی ہیں۔ میرے چاروں طرف گناہ ہی گناہ ہے۔ میں اوباشوں کے نرغے میں اس طبیار کی طرح ہوں جس کا وجود حریص قہقہوں سے نڈھال ہو کر تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔

میرے گرد و پیش: حی علی الصلوٰۃ! حی علی الفلاح کی صدائیں بے کار ہیں۔ میرے مینار، پرچھائیاں ہیں۔ میری امرتیاں ان ہوئے تماشوں کی چوٹ سے سوکھ چکی ہیں۔ میں ایک سناٹا ہوں، جس کا کمر بہ فقیہہ شہر کا عمامہ ہے۔ یہاں رات ڈھلتی نہیں —— ناچتی ہے —— گاتی ہے، یہ سب سے بڑی اسلامی مملکت خداداد ہے۔

الحکم الحاکمین! لیکن اس کے تماشائی اس کے حاکم ہیں اور عصمت تماشا!

وہ اس جنس کے سب سے بڑے گاہک ہیں، وہ شہر کے ضمیر میں ایک کانٹا! اور میں —— یزید کے دربار میں اہلبیتؓ کی آبرو! تماشائی، عفتوں کے سوداگر، اپنی لمبی لمبی داڑھیوں، بلند بانگ اختیاروں اور روشن جبینوں کے ساتھ آتے ہیں۔ . . . اور علی الصبح مؤذن کی آواز . . . . .

"الصلوٰۃ خیر من النوم"

کے کچوکے سہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تکبیر تھکے ہارے جسموں کو چونکا دینے والا ناقوس ہے۔ شب بیداری کی گھنٹی ہے۔ کہ لیلیٰ تھک چکی ہے۔ مجنوں جا سکتے ہیں۔

یارب العالمین! میں کعبہ کی بیٹی ہوں
سنگ وخشت کا پیکر!
یہ آدم کی بیٹی ہے —— گوشت پوست کا مجسمہ!

میں اس کے نیلام سے اکتا چکی ہوں۔ یہاں ہر دریچہ میں "قرارداد مقاصد" جھلس رہی ہے۔ ہر ڈربے میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کا گوشت لٹک رہا ہے۔ قرآن کی آیتیں کراہ رہی ہیں۔ داڑھیوں کو آگ لگ چکی ہے۔ قباؤں پر معصیت غزار ہی ہے اور فرزندان سلطنت! ان عصمت مآب بہنوں کے غیرت مآب بھائی ہیں؟ وقت کیلنڈر کے اوراق کی طرح بدل رہا ہے۔ آنچلوں میں معانقہ ہو رہا ہے۔

ع مرا اے کاشکے مادر نزادے

میں تھک گئی ہوں رب کعبہ! میرے میناروں کو منہدم کر دے۔ میرے محرابوں کو اجازت دے کہ انہیں زمین نگل لے۔ میرے منبر کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دے۔ میرے وجود کو لاوے کی طرح پگھلا دے۔ میرا انگ انگ سلگ رہا ہے۔ میں شعلہ جوالہ بن رہی ہوں۔ میری آگ پھیل رہی ہے —— مجھے ایک وسیع قبرستان میں بدل دے —— ان حاکموں کے لیے زمین کی پیٹھ سے زمین کا پیٹ بہتر ہے —— جو عورت کو سیاست کے نذر، بازار کا محاذ سمجھتے ہیں اور جن کے لیے، جاگتی راتوں کی دلآویز گستاخیوں کے مرحلے ہیں۔

"الصلوٰۃ خیر من النوم"

کی صدا ایک نستعلیق گالی ہے۔ ہم سب کے پالنہار میرا دور جنگل کی آگ بن رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی آنچ اس درویش کو کروٹ لینے پر آمادہ نہ کر دے۔ جو اس آرزو میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا ہے کہ

ع کار جہاں دراز ہے تو میرا انتظار کر

اور جو صبح قیامت کے لیے، اس تمنا کے ساتھ محو خواب ہے کہ

ع ننگا ہے یا رسول اللہ ننگا ہے

میں ہوں آپ کی بدنصیب بیٹی۔

شاہی مسجد لاہور

اگر آپ سیاسی کارکن ہیں تو

حافظ محمد الیاس

# سوچ کر جواب دیجئے!

**ایک** مفکر اپنی قوم کے لیے سوچتا ہے اور ایک سیاستدان صرف اپنے لیے ــــــ یہ قول جب بھی پردۂ ذہن پر نمودار ہوتا ہے پاکستان کی کئی شخصیتیں اور ان کی خوشگوار یادیں دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔ چند ہی سالوں کی بات ہوگی مگر چند قرنوں کی بات معلوم ہوتی ہے کہ پاکستان میں آدمیوں اور انسانوں کے درمیان اتنا فرق پیدا نہیں ہوا تھا جتنا اب موجود ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جو لوگ اپنے خدا کے بلاوے پر اس دنیا کو چھوڑ گئے ان میں سیاسی شخصیتوں کی تعداد بھی اتنی تھی کہ آج کی سیاہ، گدلی اور بسا اوقات تعفن سے بھرپور فضاؤں میں ان کی یادوں کی خوشبو مہک اور روشنی اجالا بکھیرنے لگتی ہے۔

نام لینے کی ضرورت نہیں، ہمارے موجودہ پاکستان میں جو سیاست دان نظر آتے ہیں ان کا مقابلہ ان لوگوں سے کر کے دیکھیے جو اپنا کام پورا یا ادھورا کر کے اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ موجودہ سیاست دان اثرات، شخصیت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے اعتبار سے ان کا پاسنگ بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ یہ بات بیکر خلوص، نیک نیتی، سادگی، کفایت شعاری، شرافت، سلامت روی، وضعداری اور ذہنی بلندی کے لحاظ سے ان موجودہ لیڈروں کا ان سے موازنہ کیا جائے۔ ذرا آنکھ بند کر کے ایسے پاکستان کا تصور کیجیے جس میں قائداعظمؒ تھے، لیاقت علی خان تھے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے، حسین شہید سہروردی تھے، عبدالرب نشتر تھے اور پاکستان کے کونے کونے میں ان کی آواز گونجتی تھی۔ یہ لوگ بادلوں کی طرح برستے اور شیروں کی طرح گرجتے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے تھے اور قوم ان کی آواز سننے کے لیے گوش بر آواز رہتی تھی۔

عجیب بات نہیں کہ یہ بھی ہمارے موجودہ سیاستدانوں کی طرح انسان تھے۔ ان کا بھی دل تھا، ان کے بھی جذبات تھے، یہ بھی ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے۔ تقسیم سے پہلے بھی اور تقسیم کے بعد بھی مگر ان میں ایک دوسرے کی شخصیتوں کا اتنا پاس لحاظ تھا کہ انہوں نے کبھی ایک دوسرے پر دشنام طرازی نہیں کی۔

آج ہے کوئی لیڈر جو قائداعظمؒ سے زیادہ پاکستان سے محبت اور وفاداری کا دعویٰ کر سکتا ہو؟ مگر آپ نے کبھی سنا ہے کہ قائداعظمؒ نے کسی کو غدار، ملک دشمن، وطن فروش اور سازش کار قرار دیا ہو۔ قائداعظمؒ، ان کے ساتھی اور اس دور کے دوسرے رہنما اخلاص کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کے سامنے اپنی عزت نہیں تھی، اپنے مفاد نہیں تھے، اپنا وقار نہیں تھا، ان لوگوں کے سامنے نومولود پاکستان تھا جس کے جسم پر خونِ آزادی کے دھبے تھے، یہ لوگ ایک ہی لگن، ایک ہی لاگ ایک ہی لگاؤ، ایک ہی دھن اور ایک ہی مقصد کیلئے اپنی بساط بھر کوشش کر رہے تھے۔ ان کے دور میں پاکستان کی جغرافیائی یا نظریاتی سرحدوں پر کوئی حملہ ہوتا تھا تو یہ سب سیسہ پلائی دیوار بن جاتے تھے، جو پیچھے رہ جاتا تھا اسے للکارتے اور ابھارتے تھے بلکہ بسا اوقات شرم بھی دلاتے تھے۔ ان میں کبھی کبھی تلخی بھی پیدا ہوتی تھی، جذبات میں سختی بھی آتی تھی اور اعصاب میں تناؤ بھی پیدا ہو جاتا تھا، یہ ایک دوسرے کو سخت سے سخت بات بھی کہہ جاتے تھے مگر اس انداز میں کہ نہ کسی کی غیرت پر حرف آتا تھا نہ عزت پر چوٹ پڑتی تھی۔ قائداعظمؒ اور غفار خان ایک دور کے انسان ہیں، کوئی شخص خدا را یہ بتائے کہ قائداعظمؒ نے کتنی بار باچا خان کو غدار کہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ باچا خان قائداعظمؒ کی تحریک سے متفق نہ تھے، لیکن کب اور کتنی بار یہ شخص قائداعظمؒ کے منہ آیا۔ کبھی نہیں، ایک بار بھی نہیں۔ ان لوگوں کا رکھ رکھاؤ، ایک دوسرے سے تعلق خاطر اختلافات کے باوجود موجود ہوتا تھا۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر یہ ایک دوسرے کو غدار اور ملک دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ یہ لوگ اپنی جگہ اتنے بھاری اور فکر و نظر کے اعتبار سے اتنے نکھرے ہوئے تھے کہ قوم کے سوا اور کسی بارے میں سوچتے ہی نہ تھے۔ آج کے سیاست دانوں کے سامنے قوم نہیں، پیٹ ہے، قومی وقار نہیں، شخصی وقار ہے، قوم کی بات نہیں، ذات کا مسئلہ ہے، اس لیے وہ جب کبھی بات کرتے ہیں، ایسی بات کرتے ہیں جو ان کی ذات کے گنبد کے گرد گھومتی ہے۔

پاکستان کی موجودہ سیاسی قیادت پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر ڈال لیجئے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان رہنمائی کے دعوے داروں میں اپنی جماعت سے باہر دوسرے افراد کے لیے ادنیٰ سی رعایت، ادنیٰ سا اخلاق اور ادنیٰ سی شرافت بھی موجود ہے۔ بات بات پر ایک دوسرے کو غدار، سازشی، ملک دشمن اور ملت فروش کہنا روزمرہ کا معمول بنا ہوا ہے۔ یہاں کتنے لیڈر ہیں جو مختلف اوقات میں ایک دوسرے کو غدار نہیں قرار دے چکے اور پھر وفاداری کے سرٹیفکیٹ انہوں نے تقسیم نہیں کیے۔ کوئی ایک ــــــ دو چار کچھ تلاش کیجئے۔ اگر کوئی نہیں تو یہ قومی المیہ ہے۔

جس ملک میں ملک کی ہر اہم شخصیت غدار قرار دے دی گئی ہو۔ اس میں وفاداری کا جوہر کہاں سے آ گا اور پھر جو لوگ بدقسمتی سے بزعم خود ملک کی ساری محبت، وطن کی تمام تر وفاداری اور قوم کی ہمہ تن جاں نثاری کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں۔ ان کی اپنی کیا حالت ہے، یہ دیکھنے کے لیے ان کی معاشرتی زندگی پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے۔ یہ لوگ جن بستیوں میں بستے ہیں، جن محلات میں رہتے ہیں۔ ان کے شب و روز کے جو اشغال ہیں ان کو دیکھ کر ان کی حب الوطنی اور قومی درد کا خود ہی اندازہ لگا لیجئے۔

ہمارے قومی رہنما اسلام کا نام لیتے ہیں، لیکن اسلام ہے کہاں۔ ان کے گھر میں ــــــ لاحول ولاقوۃ۔ ان کے گھر کی طرف اسلام کی نسبت خود اسلام کی توہین ہے۔ کیا اسلام اس لیڈر کے گھر میں ہوگا جو گھڑ دوڑ سے فارغ نہیں ہوتا۔ کیا وہ لیڈر اسلام کا نمونہ ہو سکتا ہے جس کی عملی زندگی جھوٹ اور بے ایمانی سے عبارت ہو۔ کیا آپ اس شخص کو اسلام کا اجارہ دار سمجھتے ہیں جو صبح و شام چسکی لگائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا وہ شخص اسلام کا جانثار ہے جو ائیر کنڈیشنڈ بنگلے میں رہ کر غریبوں کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ کیا ایسا لیڈر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہونے کا دعوے دار ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات آج تک نہیں سنی یا سنی ہے تو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی ہے۔

آپؐ نے فرمایا "اے دولت مند اگر تیرے پاس دولت ہے تو اس میں تیرے غریب بھائیوں کا بھی حصہ ہے" صرف اتنی ہی بات نہیں! اس نبیؐ نے یہ بھی فرمایا "اگر تیرے پاس تیرا بیٹا کھڑا ہے اور قریب ہی ایک غریب اور یتیم بچہ ہے۔ اس لمحے تیرے دل میں بیٹے کے لیے شفقت پیدا ہوتی ہے تو خبردار اپنے بیٹے کے سر پہ ہاتھ نہ رکھ، بلکہ غریب کے یتیم بچے کے سر پہ ہاتھ پھیر اور اس کے سر کو چوم لے۔ اس کے سر پہ جتنے بال ہوں گے تیرے اعمال میں اتنی ہی نیکیوں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔"

آج ہمارے کتنے نام نہاد لیڈروں کو نبیؐ کا یہ فرمان یاد ہے۔ کتنے سرمایہ دار سیاستدان اس فرمان پہ عمل کرتے ہیں ذرا سوچ کر جواب دیجئے!!

# کُتب مولانا ابوالکلام آزاد

| | | | |
|---|---|---|---|
| اُمّ الکتاب | ۲۲/۵۰ | نبی و یارانِ نبی کے آخری لمحات | ۴/۵۰ |
| اسلام کا نظریہ جنگ | ۷/۵۰ | اکابر اسلام کے آخری لمحات | ۴/۵۰ |
| مسلمان عورت | ۱۱/- | اسلامی جمہوریت کے تقاضے | ۳/- |
| جامع الشواہد | ۷/۵۰ | قولِ فیصل | ۱۵/- |
| ہجر و وصال | ۱۵/- | غبارِ خاطر | ۲۱/- |
| کاروانِ خیال | ۵/۵۰ | شہیدِ اعظم | ۵/- |
| درسِ وفا | ۴/۵۰ | ولادتِ نبویؐ | ۵/- |
| مسئلہ خلافت | ۱۲/- | حضرت یوسفؑ | ۵/- |

| | | |
|---|---|---|
| ترجمان القرآن اول ۳۵/- | ترجمان القرآن دوم ۴۰/- | ترجمان القرآن سوم ۲۵/- |

ان کے علاوہ ہر قسم کی کتب خریدنے کیلئے ہمیں یاد فرمائیں

## بساطِ ادب

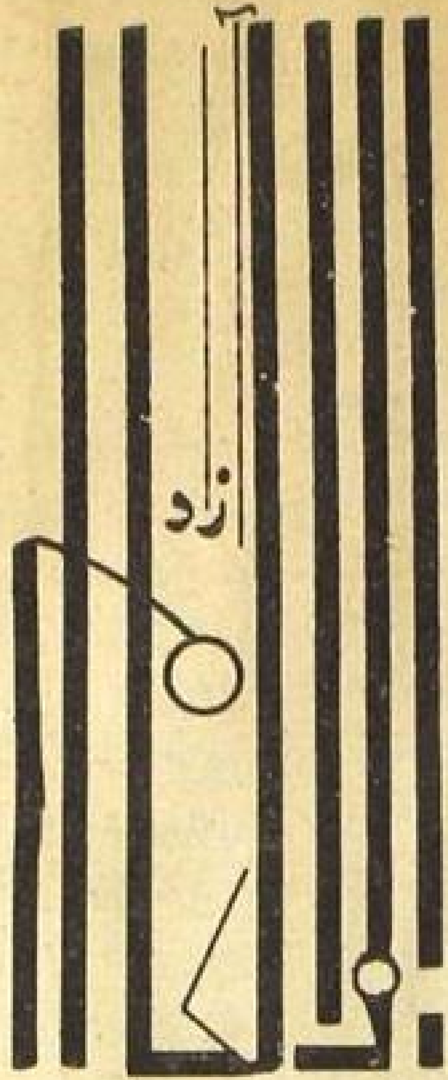
ادبی مارکیٹ
چوک انارکلی
لاہور












## قاضی افضل حق قریشی

"یہ دونوں بزرگ ایک ہی زمانے میں، ایک ہی ملک میں اور ایک ہی ماحول میں باندازِ بے التفاتی یا برنگِ تغافل ایک دوسرے کو دور سے دیکھتے رہے —— اور ایک دوسرے کے بارے میں، دوسروں کی زبانی باتیں سنتے رہے —— میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے یا نہیں۔ اس میں مجھے شبہ ہے۔ اس اندازِ تغافل کو کس چیز پر محمول کیا جائے؟ رنگِ ناآشنائی! معاصرانہ چشمک؟ یا اختلافِ مزاج و مشرب و مسلک؟ بزرگوں کے معاملات ہیں، ناموروں کی باتیں ہیں، بڑوں کے مسائل ہیں، ایک خورد، ایک ذرۂ حقیر، خاکِ پا، ان جھگڑوں کی وجہ بیان کرے تو قصہ دار و رسن نہ سہی، سنگِ خلائق کا نشانہ بننا تو لازمی ہے۔ کیا کہا جائے اور کیا کیا جائے!

علامہ اقبال نے مسائل و مشکلات کے بارے میں صدہا اہلِ علم و فضل سے مشورہ کیا —— اس فہرست میں اصاغر بھی ہیں اور اکابر بھی، علمائے دین بھی ہیں اور فضلائے جدید بھی —— مگر فہرست سے جو نام غائب ہے وہ ابوالکلام کا ہے —— مجھے معلوم نہیں کبھی دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوں (ممکن ہے ملے ہوں)، خط و کتابت بھی شاید ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

امام الہند نے تذکرہ سے کر غبارِ خاطر۔ اپنی نثر کو فارسی، اردو کے متعدد شعرا کے شعروں سے مزین کیا ہے۔ لیکن اگر نہیں کیا تو علامہ اقبال کے شعر سے نہیں کیا۔ داغ تک کے اشعار ہیں، مگر اقبال کے نہیں!

یہ رنگِ ناآشنائی ہے تو عجیب رنگ ہے، معاصرانہ چشمک ہے تو عجیب چشمک ہے۔ یہ اختلافِ مزاج ہے تو عجیب اختلافِ مزاج ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے وجود ہی کا انکار کر دے..."

یہ ہیں الفاظ اردو کے نامور ادیب اور نقاد جناب ڈاکٹر سید عبداللہ کے۔ مجھے سید صاحب کے ان محسوسات سے بصد عجز و نیاز اختلاف ہے۔

اقبال (۱۸۷۳ء —— ۱۹۳۸ء) اور ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء —— ۱۹۵۸ء) اس صدی کے دو عبقری تھے۔ جنھوں نے برعظیم پاک و ہند کی علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مطابق:

"ابوالکلام اور اقبال اس دور کے دماغ تھے۔"

ان دونوں کا پیغام ایک ہی تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین:

"اور وہ یہ ہے کہ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولو اور اسلام کے اسمِ اعظم سے آفاق کی تسخیر کرو۔"

اور دونوں کے مابین تعلقات دوستانہ تھے۔

—— یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان کے تعلقات کی ابتدا کب ہوئی۔ البتہ دونوں کی پہلی ملاقات اپریل ۱۹۰۵ء میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ہوئی۔ مولانا آزاد اس اجلاس میں بحیثیت ایڈیٹر، "لسان الصدق" مدعو تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا کی زبانی لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو مخزن نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا، لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہو گئی تھی۔ انجمن میں ان کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سُنی جاتی تھی۔ ان سے بھی پہلی مرتبہ اس سفر میں ملاقات ہوئی۔"

مولانا آزاد نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا۔ اس ہفت روزہ نے ملک بھر کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے مطابق:

"الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلّم طور پر مولانا ہو گئے اور شہرت کے پروں سے اڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی۔"

اصل میں "الہلال" ایک تحریک تھی۔ اسلامیانِ ہند کی بیداری کی تحریک۔ اس نے تھوڑی ہی مدت میں علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ عوام تو عوام، خواص بھی چونک اُٹھے اور انہیں یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ ہم سب اپنے اصلی کام بھولے ہوئے تھے۔ "الہلال" نے ہمیں یاد دلایا۔ ملک کے مختلف گوشوں سے اس کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات اٹھے۔ اقبال نے بھی "تحریکِ الہلال" سے دلچسپی اور ہمدردی کا عملاً اظہار کیا۔ چنانچہ انھوں نے "الہلال" کے لیے دس خریدار مہیا کیے۔ مولانا آزاد ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:

"الہلال کی توسیع اشاعت کے لیے ابتدا سے بغیر کسی تحریک اور طلب کے جو احباب سعی فرما رہے ہیں دفتر ان کا شکر گزار ہے۔ ایسے حضرات تو بکثرت ہیں۔ جنھوں نے ایک ایک یا دو دو خریدار بہم پہنچائے، مگر جن احباب نے خاص طور پر اس بارے میں سعی کی ہے ان کے اسمائے گرامی شکریے کے ساتھ درج ذیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو مخلص اور بغیر منت و طلب احسان کرنیوالے احباب عطا فرمائے۔"

اس فہرست میں سب سے زیادہ یعنی بارہ خریدار دہلی کے ایک صاحب نے مہیا کیے۔ مگر اپنا نام ظاہر نہ کیا۔ اور دس دس خریدار علامہ اقبال اور مولانا سید عبدالحق بغدادی، نائب پروفیسر عربی محمڈن کالج علی گڑھ نے مہیا کیے۔

اقبال کی نظم "جوابِ شکوہ" ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو جلسۂ امداد مجروحین بلقان منعقدہ باغ بیرون موچی دروازہ، لاہور میں پڑھی گئی۔ الہلال کی ۲۶ فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں ریاست رام پور کے ہوم سیکرٹری صاحبزادہ مصطفیٰ خان شرر کی ایک طویل نظم "جوابِ شکوہ کا اقبال" کے عنوان سے اس کی تائید میں چھپی۔ یہ الہلال کے دو صفحات پر محیط تھی۔ اس کا آخری بند یہ ہے:

آج اگر حال زبوں ہے تو الم بے جا ہے
قلبِ اقبال ہوا ہے تو اچنبھا کیا ہے
دیکھیے باغ اُجڑتا ہے، کبھی پھلتا ہے
تنگ دل ہیں تو کریں صبر، یہی اچھا ہے
جب بہار آتی ہے، کلیوں کی چٹک کہتی ہے
کب ہمیشہ خلشِ تنگ دلی رہتی ہے

۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو "الہلال" سے پریس ایکٹ کے تحت دو ہزار روپے کی ضمانت طلب ہوئی، جو ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو ضبط کر لی گئی اور "الہلال" کے نمبر بابت ۴ اکتوبر و ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء بھی ضبط ہوئے۔

مولانا ان دنوں کلکتہ سے باہر تھے۔ جب انھیں دفتر کی طرف سے اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے بذریعہ تار ہدایت کی کہ:

"جو نمبر چھپ رہا ہے اس کو فوراً شائع کر دو ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کر دو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک الہلال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ العزیز رکھیں گے۔"

چنانچہ "الہلال" کا ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کا شمارہ شائع ہوا، مگر ساتھ ہی دس ہزار روپے کی نئی ضمانت مانگ لی گئی۔ ضمانت داخل نہ کرائی گئی اور اس طرح "الہلال" بند ہو گیا۔ پانچ ماہ بعد مولانا نے البلاغ پریس اور ہفتہ وار البلاغ جاری کیا۔ البلاغ کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو چھپا۔ اس کے صفحۂ اوّل پر اقبال کی یہ نظم چھپی:

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی،
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی
مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بیتابی
تغیر آ گیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
کہ رخصت ہو گئی دُنیا سے کیفیتِ وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی، بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بےخوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو، ظلمت ربا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی، شکوۂ اہلِ جہاں کم کن
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

البلاغ میں اس نظم کا عنوان عرفی کے شعر کا مصرعۂ اولیٰ تھا۔ بانگِ درا میں یہ "عرفی" کے عنوان سے چھپی۔ بانگِ درا میں اسے شامل کرتے وقت چند اشعار میں ترامیم کی گئیں جو یہ ہیں:

البلاغ:
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی
بانگِ درا:
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشکِ عنابی
البلاغ:
تغیر آ گیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
بانگِ درا:
مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آ گیا ایسا
البلاغ:
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم کن
بانگِ درا:
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو

یہ حقیقت ہے کہ الہلال اور البلاغ کے صفحۂ اوّل پر کبھی کوئی نظم شائع نہیں ہوئی۔ صرف اقبال کی نظم کو یہ مستثنیٰ مقام حاصل ہوا۔ شبلی سے مولانا آزاد کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کی متعدد نظمیں الہلال میں چھپیں مگر پہلا صفحہ اقبال کے سوا کسی کو نہ ملا۔ اس نظم میں مولانا آزاد کو جو پیغام دیا گیا، وہ محتاجِ تشریح نہیں۔

حکومت نے محسوس کیا کہ محض پریس ایکٹ کے استعمال سے مولانا آزاد کی سرگرمیاں رُک نہیں سکتیں، سو اس بار قانون تحفظ ہند کی دفعہ ۳ کے تحت انہیں کہا گیا کہ چار دن کے اندر اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دیں اور حدود بنگال سے نکل جائیں۔ بعد میں یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھا دی گئی۔ اس سے پہلے حکومتِ پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی اسی قانون کے تحت مولانا کا داخلہ اپنے صوبوں میں بند کر چکی تھیں۔ چنانچہ مولانا رانچی (بہار) چلے گئے، جہاں پانچ ماہ بعد نظر بند کر دیے گئے۔ اس طرح ساڑھے چار مہینے بعد البلاغ بند ہو گیا۔

مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے کہ اقبال کی مثنوی "رموزِ بےخودی" چھپی۔ اقبال نے اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد کو بھیجا اور انھوں نے ایک خط میں اسے بہت پسند کیا۔ اقبال سید سلیمان ندوی کے نام ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"والا نامہ ابھی ملا ہے، رموزِ بےخودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔
آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے، انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔"

مولانا آزاد کا تذکرہ ۱۹۱۹ء میں ان کے زمانۂ اسارت ہی میں چھپا۔ فضل الدین احمد مرزا نے مقدمہ میں "مذہبی انقلاب" کے زیرِ عنوان "الہلال" کے اثرات کے بارے میں لکھا :

"مثال کے طور پر میں صرف چند محترم ناموں کا ذکر کروں گا۔ طبقۂ علما میں سے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کا یہ قول خود مولانا ابوالکلام نے ایک مرتبہ مجھ سے نقل کیا تھا کہ "ہم اصل کام بھولے ہوئے تھے۔ الہلال نے یاد دلایا" ——— تعلیم یافتہ جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی خاں اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھلائی اور بتدریج اپنے رنگ میں یک قلم رنگ دیا ——— ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا تھا، اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔"

اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کے خط میں جہاں تذکرہ، مولانا آزاد اور تحریکِ الہلال کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے، وہاں فضل الدین احمد مرزا کی مندرجہ بالا تحریر پر خفگی کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے، مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریکِ الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں، نظم و نثر، انگریزی و اردو موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ کہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریکِ الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے، ان میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" معلوم نہیں، انہوں نے کیا سنا تھا اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایک ایسا جملہ لکھا، جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علم بردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ مؤخر الذکر شکایت براہِ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجیے۔"

تذکرہ مولانا کی رائے اور مرضی کے خلاف فضل الدین احمد مرزا نے شائع کر دیا تھا۔ مولانا پورا چھاپنا چاہتے تھے، فضل الدین احمد نے مختلف اجزا روک لیے اور مولانا کے بیان کے مطابق دوسری جلد کا مسودہ بھی انہیں کے پاس تھا۔ مولانا کی رہائی سے پیشتر موصوف پنجاب آ گئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ مسودہ تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ مولانا آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"——— تذکرہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی۔ ایک صاحب نے بطور خود شائع کر دیا۔ بوجوہ اس کی اشاعت میرے لیے خوش آیند نہ ہوئی۔"

معلوم نہیں سید سلیمان ندوی، اقبال کی شکایت فضل الدین احمد مرزا تک پہنچا سکے یا نہیں البتہ مولانا آزاد کو ضرور پہنچائی۔ اس پر مولانا آزاد نے سید سلیمان ندوی کو ۲ جنوری ۱۹۲۰ء کو لکھا :

"——— ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس کم بخت تذکرے کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل الدین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظرِ ثانی کے لیے بھیجا تھا، میں نے واپس نہیں بھیجا، اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کا پہلا حصہ شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا حصہ علاحدہ درجہ ضمنی مطولات و عدمِ انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انہوں نے بجنسہ چھاپ کر، جلد باندھ کر، یکایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرزِ تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔"

مولانا یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تو اقبال کو اس کی خوشی ہوئی اور انہیں خط بھی لکھا۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"——— الحمدللہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی کیفِ باطن میں بالخصوص آج کل "صحو" ہی کی ضرورت ہے۔ نبی کریمؐ نے صحابہؓ کی تربیت اسی حال میں کی تھی۔ "سکر" کی حالت عمل کی دشوار گزار منزل کو طے کر لینے کے بعد ہو تو مفید ہے۔ باقی حالات میں اس کا روح پر ایسا ہی اثر ہے، جیسا جسم پر افیون کا۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں۔ پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں ———"

اقبال، مولانا آزاد سے بھی مسائل و مشکلات میں مشورہ کرتے تھے اور ان کی رائے کو وقیع جانتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ۱۸ اگست ۱۹۲۴ء کے خط میں رقم طراز ہیں :

"حال ہی امریکہ کی مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک کتاب شائع کی ہے، جس کا نام "مسلمانوں کے نظریات متعلق مالیات" ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماعِ امت نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے، یعنی یہ کہ مثلاً مدتِ شیر خوارگی نصِ صریح کی رو سے دو سال ہے، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے یا حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفاء اور معتزلیوں کے نزدیک اجماع یہ اختیار رکھتا ہے مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے ؟

امرِ دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے ؟ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے۔"

سید سلیمان ندوی کے نام ۷ اگست ۱۹۳۶ء کے خط میں مولانا آزاد کا ذکر ہے۔ اقبال لکھتے ہیں :

"... الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔"

افسوس کہ فریقین کی خط و کتابت محفوظ نہیں، جس کی وجہ سے ان بزرگوں کے تعلقات کی تفصیلات نامعلوم ہیں۔ البتہ یہ بات تو یقینی ہے کہ انھوں نے

ایک دوسرے کے وجود کا انکار نہیں کیا۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ "امام الہند نے تذکرہ سے لیکر غبار خاطر تک اپنی نثر کو فارسی اُردو کے متعدد شعرا کے شعروں سے مزین کیا ہے، لیکن اگر نہیں کیا تو علامہ اقبال کے شعروں سے نہیں کیا۔" اس ضمن میں مولٰنا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

" مولانا نے غالباً دو یا تین مقامات پر حضرت علامہ کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ لیکن زیادہ تر وہی اشعار انسان کے حافظے میں محفوظ رہتے ہیں۔ جو ابتدائی دور میں نظر سے گزر چکے ہوں۔ اگر نقل نہیں ہوئے یا زیادہ نقل نہیں ہوئے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔"

۱۹۰۵ء کی پہلی ملاقات کے علاوہ اقبال اور مولانا ابوالکلام کی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ چند ایک کی تفصیلات یہ ہیں :

۱۹ فروری ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ساتھ لاہور آئے اور اقبال سے ملاقات بھی ہوئی۔ یہ وفد مسلمانان ہند کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر وفد کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ شام چار بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ اراکین وفد اور مولانا آزاد جب جلسہ گاہ میں آئے تو حاضرین جلسہ کی طرف سے ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور بے شمار پھول برسائے گئے۔ اس کے بعد حاجی شمس الدین سیکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے نواب ذوالفقار علیخان رئیس مالیر کوٹلہ و سابق وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کے صدر جلسہ بنائے جانے کی تجویز پیش کی جو اقبال کی تائید سے باتفاق رائے حاضرین منظور ہوئی۔ نواب ذوالفقار علی خان نے افتتاحی تقریر کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر عدنان بے اور عمر کمال بے نے ترکی میں تقاریر کیں، جن کا ترجمہ علامہ توفیق بے۔ ایڈیٹر رسالہ "سبیل الرشاد" قسطنطنیہ نے فارسی میں کیا۔ ان کے بعد چوہدری غلام حیدر خان پرسنل اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار اور حاجی شمس الدین نے تقاریر کیں۔ مولانا آزاد وفد کے ہمراہ اسی شام واپس چلے گئے کہ دوسرے دن دہلی میں بھی جلسہ ہو رہا تھا۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خان نے مولانا آزاد پر زور دیا کہ مزید ایک روز لاہور میں قیام فرمائیں۔

ایک ملاقات کے راوی ڈاکٹر شیر بہادر خان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

" ایک دفعہ مولانا لاہور تشریف لائے اور حسب معمول میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء کی کوٹھی پر فروکش ہوئے۔ ان کے ہاں خواص کی ایک مجلس عصر کے قریب منعقد ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ اقبال بھی وہاں موجود تھے۔ اس محفل میں میں اور میرا ایک دوست بھی جا پہنچے۔ مولانا نے وقت کے کسی مسئلہ پر (وہ مسئلہ اب ٹھیک یاد نہیں) فرش پر بیٹھے بیٹھے تقریر کی۔ جب تقریر کر چکے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ علامہ اقبال سے مخاطب ہوئے اور استفسار کیا " کیوں علامہ صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟" علامہ مرحوم نے فرمایا " مولانا مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔"

ایک اور ملاقات کے راوی مولانا غلام رسول مہر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

" ایک ملاقات میرے سامنے نواب سر ذوالفقار علی خان مرحوم کی دعوت طعام پر ہوئی تھی۔ حضرت علامہ نے بطور خاص فرمایا تھا کہ ہمیں مولانا آزاد کے پاس بٹھایا جائے تاکہ ان سے باتیں کر سکیں۔ میں نے اس کا انتظام کیا اور کھانے کے دوران میں دونوں بزرگ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔"

یہ تو تھی اقبال اور ابوالکلام کی خط و کتابت اور ملاقاتوں کی داستان جس سے زندگی میں ان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مولانا آزاد کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔ مولانا نے ایک بیان میں اظہار افسوس کرتے ہوئے اقبال کو یوں خراج تحسین پیش کیا :

۲۵ اپریل ۱۹۳۸ء کو مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام ایک خط میں بھی اس سانحہ پر ان الفاظ میں اظہار افسوس فرمایا :

" اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔
بہت سے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں "

AN INTERVIEW WITH CHAUDHRY REHMAT ALI

TAKEN FROM BOOK

# میرا پاکستان

# INSIDE INDIA

BY KHALIDA ADEEB KHANAM TURKEY

(FIRST TIME – AFTER 45 YEARS)

> خالدہ ادیب خانم نے کہا، کیا پاکستان آزاد ہو کر اپنی اقتصادی ضروریات میں خود کفیل ہو سکے گا۔ چودھری رحمت علی کہنے لگے! ولایت پاکستان کے اخلاقی و مادی ذرائع آمدنی بہت وسیع ہیں۔

## انٹرویو

## خالدہ ادیب خانم ترکی

ترکی کی شہرۂ آفاق انقلابی خاتون خالدہ ادیب خانم نے سیاست ہند کے تاثرات کتابی صورت میں قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب کا نام INSIDE INDIA (درون ہند) ہے جو پینتالیس سال پیشتر انگلینڈ میں شائع ہوئی۔ اس میں آپ نے اسلامی ہندی سیاست پر تبصرہ فرماتے ہوئے پاکستان نیشنل تحریک پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ اشاعت کتاب سے پہلے آپ نے بانی تحریک چودھری رحمت علی سے دو دفعہ لندن اور پیرس میں ملاقات فرمائی اور پاکستان کے متعلق باب انہی . . . ملاقاتوں کا مرہون منت ہے۔ اس باب کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے تحریک کے مختلف پہلو بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

مسٹر رحمت علی نے اپنی تعلیم انگلینڈ میں مکمل کی۔ جہاں انہوں نے کیمبرج اور ڈبلن کی یونیورسٹیوں سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ ایک قابل قانون دان تھے اور آپ کو سیاسی تاریخ کے تعمیری پہلو میں خاص شغف تھا، لیکن آپ نے وکالت کا پیشہ ترک کر کے "پاکستان نیشنل تحریک" کا اجرا کیا۔ اس وقت ان کی حیات کا غالب جذبہ اور مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل ہے۔

میں نے ملاقات کے دوران میں محسوس کیا کہ وہ تلخی جو چودھری صاحب (رحمت علی صاحب) کے دل میں ہندو کی مہاسبھائیانہ اور اسلام دشمن ذہنیت سے جوانی میں پیدا ہو گئی تھی۔ ہرگز ان کے نظریہ پاکستان پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ وہ اس تحریک کی بنیاد ہندو کی عداوت پر نہیں رکھتے۔ فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریک ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے میں کہاں تک عملی طور پر مفید ہو سکتی ہے، لیکن ہندوستانی حالات کے غیر جانب دار مبصر کو اسے نگاہ میں رکھنا چاہیے، کیونکہ جو عناصر اس وقت ہندوستان میں دو قوموں کی جداگانہ ہستی اور موجودگی کے حق میں کام کر رہے ہیں وہ کافی اہم ہیں۔

میں یہاں پاکستان نیشنل تحریک کا لب لباب اس کے بانی کے الفاظ ہی میں بیان کرتی ہوں جو ہماری ملاقاتوں کا نتیجہ ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے کہ پاکستان نیشنل تحریک کی تخلیق کا باعث کیا ہے۔ میں گذشتہ اسی سال کی ملکی تاریخ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اسلامی حکومت ۱۸۵۷ء کے بعد ختم ہو گئی، یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ جسے بیرون ہند سمجھنے کی کوشش کی گئی اور وہ یہ ہے کہ پہلے پہل مسلمان کا وطن پاکستان یعنی وہ حصہ ملک تھا جو مشتمل ہے پنجاب (پ) سرحد افغانی (ا) کشمیر (ک) سندھ (س)، بلوچستان (تان) پر ہیں نے پاکستان کا نام ان ہی پانچ صوبوں کے ناموں سے حاصل کیا ہے۔ مسلمان یہاں ۱۲۰۰ سال سے آباد

# ہندو کی تنگ نظری اور اسلام دشمن ذہنیت نے پاکستان کو جنم دیا ہے۔

چلے آتے ہیں۔ وہ علیحدہ تاریخ و تمدن اور ثقافت کے مالک ہیں۔ اس ملک اور اصلی ہندوستان کی حد فاصل دریائے جمنا ہے اور یہ کسی صورت میں ہندوستان کا حصہ نہیں گو آج سے کم و بیش بارہ سو سال پہلے ہندوؤں کی حکومت تھی۔ مگر وہ سنہ ۱۲... سے ایک اقلیت کی حیثیت سے رہتے رہے ہیں۔

پاکستان کی کل آبادی چار کروڑ بیس لاکھ ہے (۴۲۰۰۰۰۰۰)۔

جس میں سے تین کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں وہ نسبی طور پر وسط ایشیا سے تعلق رکھتے ہیں اور مجلسی طور پر ان کی ایک جداگانہ تہذیب ہے جو ہندوستان سے کلیتہً مختلف ہے۔ اس اختلاف کا باعث اسلام ہے جس کا علیحدہ مجلسی اخلاقی اور سیاسی نظام ہے اور یہی پاکستانیوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ محترم خاتون میری خواہش ہے کہ آپ اس اساسی نکتہ کو واضح طور پر سمجھ لیں کہ پاکستان یہاں کے مسلمانوں کا قومی وطن ہے اور وہ مسلمان جو ہندوستان خاص میں آباد ہیں۔ فاتحین کی حیثیت سے وہاں گئے۔ ہندوستان اسلامی حکومت کا ایک جزو تھا، جہاں نو سو سال سے زیادہ عرصہ تک ملک کی اکثریت پر حکومت کرتے رہے، لیکن مرور زمانہ سے جب سلطنت ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تو وہ مسلمان جنہوں نے ہندوستان (پاکستان کو نکال کر) کے اسلامی مقبوضات میں بود و باش اختیار کی۔ ایک اقلیت بن گئے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کا ابتدائی حصہ مسلمانوں کی قومی اور شاہی تاریخ میں ایک عجیب دور ابتلا تھا۔ اس وقت جب کہ اسلامی شوکت اور سلطنت کا قصر رفیع شکستہ ہو کر زمیں بوس ہو رہا ہے۔ اگر مسلمانوں میں کچھ رہنما موجود ہوتے جنہیں بصیرت اور جرأت سے بہرہ وافر ارزانی ہوا ہوتا۔ تو وہ اپنے قومی وطن پاکستان کی محافظت اور نگہبانی کا بندوبست کر سکتے تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کا فرق روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اول الذکر ان کا قومی اور ملی وطن ہے اور آخر الذکر میں وہ ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں جو کبھی فاتح بن کر فرمانروائی کرتی رہی ہے۔ ماتم کا مقام ہے کہ یہ بین تاریخی حقیقت یوں بے رحمی سے نظر انداز کر دی گئی ہے اور دونوں ملکوں (پاکستان اور ہندوستان) کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ یہی ہماری موجودہ مصائب کا منبع ہے۔ آج اس نتیجہ خیز موقع پر جب پاکستان اور ہندوستان دونوں کا مستقبل از سر نو تعمیر ہو رہا ہے۔ یہ ساری حقیقت ان خود غرض شعبدہ بازوں کے طفیل مسخ ہو رہی ہے جو موجود ہیں۔ برطانوی استعمار پسندوں، ہندو سرمایہ داروں اور مسلمان زمانہ سازوں اور ابنائے وقت کا۔ انگریز اور ہندو تو اپنے استحکام میں مصروف ہیں، لیکن مسلمان ان نظریات کی نشر و اشاعت کر رہے ہیں جو ان کے آبائے وطن کے لیے سم قاتل کا اثر رکھتے ہیں۔

**چند ابرو منتقیت کے مسلمان سیاستدان مجموعی حیثیت** ... مسلمانوں کی ایک جماعت ہے جو دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اولاً فرقہ پرست یہ انگریز کے حامی اور ہندو کے دشمن ہیں۔ اور ان کی پالیسی برطانیہ کے اشارہ چشم و ابرو پر رقص کرتا ہے۔ ثانیاً "وطن پرست" یہ ہندو کے حامی اور انگریز کے دشمن ہیں اور ان کی پالیسی ہندو سرمایہ داری اور ہندو نیشنلزم کے تابع ہے۔ یہ دونوں گروہ یعنی فرقہ پرست اور وطن پرست اپنی علیحدہ پالیسی کوئی نہیں رکھتے اور نہ انہیں کبھی یہ سوچنے کی ہی توفیق ارزانی ہوئی ہے کہ پاکستان مسلمانوں کا آبائی وطن ہے اور انشاء اللہ رہے گا اور اسے ہندوستان اور ہندوؤں کے نیشنل اغراض سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حالات کی یہ رفتار سنہ ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۲ء کے درمیان منعقد ہونے والی گول میز کانفرنسوں نے ہندوستانی وفاق کا تصور پیدا کیا۔ اس وفاقی نظام میں پاکستان کو ایک انتظامی حصہ بنا کر ہندوستانی وفاق کے ماتحت کر دیا گیا اور یوں پاکستانیوں کو ہمیشہ کے لیے ایک اقلیت میں تبدیل کر کے ان کو اپنے ہی ملک میں ذلیل بنا کر ہندوؤں کی خود غرضیوں کے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ہماری ملی حیات کے لیے یہ زبردست اور مستقل خطرہ ہے اور اسی خطرہ کے احساس نے ہمیں پاکستان نیشنل تحریک کے اجرا پر مجبور کیا۔ یہ تحریک ایک سیاسی تجویز کی مرہون منت ہے جو صدیوں کی فراموش شدہ تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ ہماری تجویز ایک آزاد اور علیحدہ پاکستان کا تصور ہے جو شمال کے پانچ صوبوں پر مشتمل ہے اور جس کا سیاسی درجہ ہندوستان اور دیگر مہذب قوموں کے برابر ہو گا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ حل دونوں قوموں (پاکستان کے مسلمان اور ہندوستان کے ہندو) کے لیے آبرومندانہ زندگی کا تحفظ کرے گا اور دونوں کو برطانوی شہنشاہیت کا آلۂ کار بننے سے بچائے گا۔ ہم نے یہ حل مختلف گول میز کانفرنسوں میں پیش کیا۔ اس کے بعد ہندوؤں کے نمائندوں کے سامنے بھی اسے رکھا اور بالآخر پارلیمنٹری جائنٹ کمیٹی سے بھی اپیل کی۔ لیکن ہندوؤں اور انگریزوں دونوں نے ہمارے آزادی اور انصاف کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔ اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کے حصول کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

**خالدہ ادیب خانم:** آپ کا یہ مقصد انگریزوں کی مرضی کے بغیر کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

**چودھری صاحب:** ہم نے اپنی طرف سے پوری قوت انہیں یہ باور کرانے میں صرف کر دی ہے کہ پاکستان ہمارے لیے موت و زندگی کا مسئلہ ہے لیکن وہ ابھی تک اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو اس حالت میں ہم بھی اپنے اس قومی مطالبہ سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ انہیں یہ غلط فہمی ہے کہ ہم اسلامی سلطنت کے احیا کے خواب دیکھ رہے ہیں یا ہم پان اسلامزم کی تحریک کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی وطن پرستی کی تو قدر کرتے ہیں، لیکن پاکستانیوں کے جذبہ حب وطن کو اپنے لیے بدشگونی سمجھتے ہیں۔ یہ ایک فاش غلطی اور حالات سے غیر معقول ناواقفیت ہے۔ گو یہ حقیقت ہے کہ پاکستان نیشنل تحریک پاکستان کے مسلمانوں کی سربلندی اور ترفیع کا عزم لیے ہوئے ہے، لیکن اس سے ہرگز یہ مترشح نہیں ہوتا کہ ہم ہندو یا انگریز کے دشمن ہیں اور ہم اس کا بھی اعلان کیے دیتے ہیں کہ ہمیں پان اسلامک تحریک سے کوئی وابستگی نہیں۔ ہم محض پاکستانی ہیں اور ہمارا مذہب حسن اتفاق سے اسلام ہے اور بھی ہم روایات ماضی پر اتنے ہی نازاں ہیں، جتنے اپنے درخشاں مستقبل کے متعلق پُر امید ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں ہم ایک اقلیت ہوں گے اور ہندوستان کے باہر (پاکستان میں) چار کروڑ کی مضبوط اور زبردست قومیت۔

ہمارے آبائی وطن پاکستان کی حیثیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم تین کروڑ مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں

# ہمارا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔

کا دسواں حصہ ہیں۔ مزید برآں جمعیت الاقوام کے چوتن ارکان میں سے اکاون اقوام پاکستان سے رقبہ اور آبادی دونوں میں چھوٹی ہیں۔ پاکستان کا رقبہ اٹلی سے چارگنا جرمنی سے تین گنا اور فرانس سے دوگنا ہے اور اس کی آبادی آسٹریلیا سے سات گنی سپین سے دوگنی اور فرانس اور اٹلی کے علیحدہ علیحدہ طور پر برابر ہے۔ ہم اپنے آبائی وطن پر نازاں ہیں اور ہم نے عزم راسخ کر لیا ہے کہ اپنے وطن عزیز کو ہر تخیلی یا فوجی حملہ سے بچائیں گے خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو خواہ نا مسلمانوں کی طرف سے! ہمارے اس جذبہ کو دنیا کی کوئی طاقت کچل نہیں سکتی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہم کشمکش حیات میں چند در چند مصائب میں مبتلا ہیں، لیکن یہ درخشاں حقیقت ہم فراموش نہیں کر سکتے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے اسی سرزمین میں ان سے کہیں زیادہ عظیم الشان مصائب کا مقابلہ نہایت پامردی اور کامیابی سے کیا ہے۔ ہمارا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے اور ہم اسے زندگی اور موت کا سوال سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مقصد مہم میری زندگی میں لباس حقیقت و عمل نہ پہن سکے، لیکن دور زمانہ سے یہ تصور پاکستانیوں کا بلند ترین نصب العین بن جائے گا جس کے لیے وہ کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں گے:

**خالدہ ادیب خانم:** پاکستانی تحریک کی حیثیت ان صوبجات میں کیا ہے جو پاکستان کا جزو ہونگے؟

**چودھری صاحب:** جو بیج ۱۹۳۳ء میں بویا گیا تھا، وہ ایک تن آور درخت بن چکا ہے اور ہمارے کام کی رفتار نہایت حوصلہ افزا ہے۔ تحریک پاکستان کے تمام اقصائے ملک میں تبلیغی مراکز ہیں اور ہر صوبہ میں ہماری مجالس ہیں جو رسالوں، اشتہاروں اور مضامین وغیرہ کی صورت میں مقاصد کی نشر و اشاعت کر رہی ہیں۔ قوم کا نوجوان طبقہ جماعتی طور پر ہمارے ساتھ ہے اور انہیں پورا احساس ہے کہ تحفظ و بقائے ذات قدرت کا اولین قانون ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر نے ہمیں پاکستان کے تحفظ کے لیے انتخاب کیا ہے اور یہی چیز آئندہ نسلوں کو ورثہ میں ملے گی۔ "امروز" شاید ہمارا مذاق اڑائے، لیکن میری آنکھیں صبح فردا کے اس دلفریب خندہ کا نظارہ کر رہی ہیں۔ جس کے حسین پردے سے ہماری کامرانیوں کا مہر منیر طلوع ہوگا۔ اس صبح امید کی نمود تک ہم نا امیدیوں کی شب تار کو اپنی قربانیوں کے نور سے روشن رکھیں گے اور وطن کے سچے فرزندوں کی طرح ہر مصیبت خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے۔

**خالدہ ادیب خانم:** کیا پاکستان علیحدہ ہو کر اقتصادی طور پر آزاد اور اپنے اخراجات کا کفیل ہو سکے گا؟

**چودھری صاحب:** یقیناً! دلاینہ پاکستان کے اخلاقی و مادی ذرائع آمدنی بہت وسیع ہیں اور برطانوی راج اور ہندو سرمایہ داری سے چھٹکارا حاصل کر کے ہم یقیناً اقتصادی طور پر اغیار کے دست نگر اور محتاج نہیں رہیں گے۔ موجودہ دفتری اور گران بار حکومت جس کے بوجھ سے قوم کی کمر ٹوٹ رہی ہے باقی نہیں رہے گا اور اس کی بجائے حکومت ملک کی خادم ہوگی نہ کہ ملک حکومت کا۔ موجودہ حکومت کے کارندے بے روح افراد ہیں۔ ان کی تنخواہوں کے پیمانے بے حد مسرفانہ ہیں اور ان کے اذہان انگریز اور ہندو کے غلام ہیں۔ ان گرانقدر مشاہروں کا بوجھ غریب ٹیکس دہندوں اور فلاش کسانوں پر پڑتا ہے۔ میں نے اس پہلو کو پوری طرح سوچ لیا ہے اور مجھے اس کے متعلق کلی اطمینان ہے۔

اس کے علاوہ کراچی ہماری ایک اعلیٰ درجہ کی بندرگاہ ہے اور ساحل خوبصورت بندرگاہ کے لیے بے حد موزوں ہے۔ پاکستان کی زمین ہندوستانی زمین سے زیادہ زرخیز ہے اور اس میں ہر قسم کی پیداوار ہو سکتی ہے۔ ہمارے معدنی ذرائع بھی چنداں بے حقیقت نہیں۔ یہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت ترقی کر رہی ہے پارچہ بافی کے علاوہ روئی اور اون کے کارخانے عرصہ سے پاکستان میں جاری ہیں۔ آمدنی کے ان ذرائع پر جنگی ڈاک و تار، آب کاری، مالیہ، انکم ٹیکس اور ریلوے وغیرہ ذرائع مستزاد ہیں جن کی آمدنی اب ساری حکومت ہند کے پاس جاتی ہے اور آئندہ ہمارے ہمارے اپنے ہی پاس رہے گی۔

**خالدہ ادیب خانم:** کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ پاکستان میں طرز حکومت کیا ہوگی؟

**چودھری صاحب:** ہمارا اولین مقصد پاکستان کو استعمار فرنگ اور ہندو سرمایہ داری کے چنگل سے آزاد کرانا ہے۔ آزادی کا مسئلہ تمام مسائل پر فوقیت رکھتا ہے۔ جہاں تک طرز حکومت کا تعلق ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ وہ اساسی طور پر جمہوری اور اشتراکی ہوگا۔ اس کا فیصلہ کردہ دفاقی طرز کا ہو یا وحدانی۔ قوم کی مرضی پر منحصر ہے اور وہ اس وقت دیکھا جائے گا جب کہ ہمارے وطن کی جداگانہ حیثیت محفوظ ہو جائے گی۔

**خالدہ ادیب خانم:** پاکستان تحریک ہندو مسلم مسئلہ پر کس طرح اثر انداز ہوگی؟

**چودھری صاحب:** جہاں تک بر صغیر کی فرقہ وارانہ منافشات کا تعلق ہے۔ اس کا ایک ہی قطعی اور آبرومندانہ فیصلہ ممکن ہو سکتا ہے اور وہ پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے (اول الذکر کے پاکستان اور آخر الذکر کے ہندوستان میں) قومی انا کی محافظت اور اظہار کی مستقل صورت پیدا ہو جائیگی۔ اس لیے مدتوں کی شکر رنجی اور سر پھٹول موانست اور دوستانہ تعلقات کی استواری میں تبدیل ہو جائے گی۔ انگریزوں اور ہندوؤں دونوں نے اپنی مخصوص اغراض کی بنا پر اس مسئلہ کے حقیقی اسباب سے تجاہل اور تغافل برت کر صورت حالات کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے، لیکن پھر بھی حقیقت باقی رہتی ہے، لیکن اس کشیدگی کی علت العلل نہ مذہبی ہے اور نہ فرقہ وارانہ بلکہ یہ بین الاقوامی اغراض کا تصادم ہے۔ مسلمان بقائے ذات کے لیے لڑ رہا ہے اور ہندو اپنی برتری کے لیے۔

ہندو پاکستان کو وانمود اور اظہار ذات کے حق سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ اسی حق کا اپنے ہندوستان کے لیے مطالبہ کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ ہزاروں سال پیشتر ہندوستان، پاکستان پر حکمران رہا ہے اس لیے آخر الذکر ان کے ملک ہندوستان کا حصہ ہے اور اس پر اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہندوستان پر ہم مانتے ہیں کہ ہمارے دور حکومت سے پہلے ۷۱۲ء تک پاکستان کے کچھ حصے ہندوستان کے زیر حکومت تھے، لیکن اس سے ان کا پاکستان پر دائمی حق ملکیت ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو ہندوستان پر ہم بھی حق جتلا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم نے ایک ہزار برس تک وہاں فرمانروائی کی ہے اور وہ ملک ہمارے زیر نگیں رہا ہے۔ محترم خاتون! دیکھئے وہ پاکستان پر ہمارے حق کو باطل کرنے کے اضطراب میں ہندوستان پر اپنے حق کو اپنی ہی دلیل کی رو سے باطل قرار دے رہے ہیں اگر ہندوستان ان کا ہے اس لیے کہ وہ اس کی آبادی کا ۳/۴ حصہ ہیں تو یقیناً پاکستان ہمارا ہے۔ اس لیے کہ ہماری آبادی یہاں ۴/۵ ہے جس بین الاقوامی قانون نے انہیں ہندوستان کا حقدار تسلیم کیا ہے وہ ہی اپنا استحقاق جتلانے کیلئے گذشتہ بارہ سو سال سے ہم نے محض پاکستان

# جب تک ہماری کشتی حیات کا لنگر قائم ہے پاکستان کو کوئی خطرہ نہیں۔

ہمیں بھی پاکستان کا جائز حقدار قرار دیتا ہے۔ پاکستان پر ہی نہیں بلکہ محض ہندوستان کی بہبود کی خاطر اپنی جوانی اور زندگی کی بہاریں قربان کی ہیں اور آج اگر ہم ہندوستان ہاتھوں سے کھو بیٹھے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی حالت میں اپنا پیارا وطن بھی تیاگ دیں گے۔ ایسا فرض کر لینے والے اپنی دانشمندی کا چنداں قابل ذکر مظاہرہ نہیں کرتے۔ ہندوؤں کا پاکستان کو سلطنت ماضیہ کی بنا پر ہندوستان کا جزو سمجھنا جنت الحمقا میں بسنا ہے۔ ان کی حکومت کی طرح ہماری حکومتیں بھی قائم رہی ہیں، لیکن ان کی حدود ان حکومتوں کے ساتھ ہی مٹ گئیں۔ للہٰذا جتنا جلدی ہم دماغ سے یہ غلط نظریہ نکال دیں گے۔ بہتر ہے گڑے مردے اکھاڑنے سے اب کیا حاصل؟ دونوں ہمسایہ قوموں کا موجودہ دور تسلسل اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس حماقت سے باز آجائیں۔ ہمارے لیے اس میں کتنے ہی سبق ہیں اور غالباً سب سے زیادہ روشن سبق یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کو اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیئے۔

اگر ہندو حقائق کو واضح طور پر اور ان کی اصلی حالت میں دیکھ سکیں تو وہ یقیناً پاکستان تحریک کا تجویز کردہ آبرومندانہ حل قبول کریں گے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ آزاد پاکستان ہی ہندو مسلم مسئلہ کو دائمی طور پر حل بھی کر سکتا ہے دریائے جمنا کے کنارے کھڑے ہو کر جو دونوں ملکوں کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ ہم دوستی اور مروت کا داہنا ہاتھ ہندوستان کی طرف بڑھاتے ہیں۔ کیا وہ ایک اچھے ہمسایہ کی طرح اسے بوسہ دیتا ہے؟ اور پاکستان کو ملکی درجہ دیتا ہے جو ہم اسے دیتے ہیں۔

**خالدہ ادیب خانم:** اس تحریک کا ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا؟

**چودھری صاحب:** دراصل اس کشمکش میں ان مسلمانوں کا خیال ہی میرے لیے کوہ اندوہ بنا ہوا ہے۔ ہم اس گوشت کو اپنے ناخنوں سے جدا نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں۔ ان کی موجودہ اور آئندہ بہتری ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہے گی۔ موجودہ حالات میں پاکستان کی علیحدگی ان کے مفاد کے منافی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ آبادی کے لحاظ سے ایک مسلمان۔ چار ہندو، اسمبلی اور دفتروں وغیرہ میں اسی تناسب کے حقدار رہیں گے جس کے وہ اب ہیں اور آئندہ کے لیے یہ ان کی حفاظت کی موثر ضمانت ہے۔ ہم تو دل سے یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کو وہی مراعات دی جائیں گی جو ہندوستان میں ہمارے مسلم بھائیوں کو حاصل ہوں گی۔ اس طرح انشاءاللہ ان سے کسی قسم کی ناانصافی روا نہیں رکھی جائے گی۔

اس خلش میں ہمارے لیے یہ تسکین کا پہلو مضمر ہے کہ ہم پاکستان کا تحفظ کر رہے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا اسی میں فائدہ ہے۔ ورنہ اس کا باعث ہماری ذاتی اغراض نہیں، پاکستان پر ان کا اتنا ہی حق ہوگا جتنا ہمارا کیونکہ وہ ہماری ملی جائے پناہ اور ان کا اخلاقی سہارا ہوگا۔ جب تک ہماری کشتی حیات کا لنگر قائم ہے اسے کوئی خطرہ نہیں، لیکن جب وہ ٹوٹ گیا تو نتیجہ سوائے موت و ہلاکت کے کچھ نہ ہوگا۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ بھائیوں کو آپس سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ وہ وقت کتنا ہی دلخراش کیوں نہ ہو، لیکن ملت کا مفاد سب پر فائق ہونا چاہیئے ملت اسلامیہ ہندیہ پر نکبت و ادبار کے گھنے بادل چھا رہے ہیں اور اس کو کونہ کونہ سے ہلاکت بازیاں جھانک رہی ہیں۔

اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو ہمیں اپنے مستقبل کو صدیوں سے ناپنا ہوگا اور اس کے مطابق پروگرام بنانا ہوگا۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نجات اب صرف پاکستان کے نظریہ ہی میں مضمر ہے۔ ان کی سعید روحیں اس دعوت کا خیر مقدم کرتی ہیں اور اسے سراہتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پاکستان کا جہاد ان کے لیے بھی اتنا ہی اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ جتنا خود پاکستانیوں کے لیے ہمیں جان لینا چاہیئے کہ خاک پیوستگی ہمیں موجودہ دور بتلائیں کامیاب نہیں کر سکتی۔ دنیا کی از سر نو تعمیر ہو رہی ہے اور سیاسی حد بندیاں اخلاقی اور روحانی وابستگیوں کے سامنے اوجھل ہو رہی ہیں جلد یا بدیر قوانین قدرت کی بے پناہیوں کے سامنے ہمیں جھکنا پڑے گا۔ کاش ہم جلد ہی اس کا اعتراف کر سکیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم حبل اللہ سے اعتصام کریں اور اپنے مقاصد سے غداری نہ کریں تو مستقبل ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر دیکھے گا۔

**خالدہ ادیب خانم:** کیا آپ سب کے لیے قومیت متحدہ ہندیہ کا تصور بہتر انتخاب نہیں؟

**چودھری صاحب:** محترم خاتون! ہم ہندوستانی پاکستانی ہیں، لیکن ہم پاکستانیوں کا ان میں مدغم ہو جانا سیاسی موت کے مترادف ہوگا۔ کیا تاریخ عالم میں ایسی ایک بھی مثال ملتی ہے کہ ایک قوم نے ہمسایہ قوم کے استحکام کی خاطر ملی خودکشی کی ہو۔ کم از کم میرے پیش نظر تو ایک بھی نہیں۔ شکست ایک لعنت ہے۔ لیکن بزدلی سے ہتھیار ڈال دینا گناہ عظیم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانوی راج اور ہندو وطن پرستی اپنے مخصوص مصالح خاطر ہم سے متحدہ ہندوستان کے نام پر قومی خودکشی کی توقع رکھتے ہیں لیکن ایسا ہونا از قبیل محالات ہے۔ ہندوستان کو متحدہ کرنا علیحدہ بات ہے۔ اس سے ہم کو تعرض نہیں، لیکن پاکستان کو غصب کر لینا اور بات ہے۔ یہ ہم کبھی گوارہ نہیں کر سکتے۔

محترم خاتون! کیا آپ نہیں سوچتیں کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ کیا اس میں دو قومیں جداگانہ ہستی برقرار رکھ کر نہیں رہ سکتیں۔ اس کا رقبہ روس کو نکال کر باقی یورپ کے برابر ہے تو اگر یورپ میں اتنے ہی رقبہ اور آبادی میں کم از کم نصف جداگانہ ملتیں آباد ہو سکتی ہیں، جن کا مذہب تمدن اور تہذیب اور اقتصادی نظام بھی ایک جیسا ہے تو ہندوستان میں نہ محض یہ کہ ممکن ہی نہیں بلکہ اشد ضروری ہے کہ دو بالکل برعکس قومیں اپنے اپنے قومی نظام ہائے حکومت ہندوستان اور پاکستان میں قائم رہ کر زندہ رہیں۔ جغرافیائی حد بندیوں اور نسلی امتیازات کو جانے دیجئے۔ انسانی دلوں اور روحوں کے ہمالیوں کو فراموش نہ کیجئے گا۔ ہمارا مذہب ثقافت تاریخ روایات ادب اقتصادی نظام قوانین وراثت اور شادی کی رسوم وغیرہ ہندوؤں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ یہ نمایاں امتیازات اور تفریقیں محض بڑے اصول تک محدود نہیں ہیں، بلکہ زندگی کی جزوی تفصیلات میں بھی ان کا اثر غالب ہے۔ ہندو اور مسلمان اکٹھے بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے اور نہ ان میں باہمی ازدواجی تعلقات ہی قائم ہوتے ہیں۔ ہماری ملی رسوم۔ ہمارے سال مہینے دن حتیٰ کہ ہماری خوراک اور لباس ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف ہیں ان ناقابل تردید حقائق کی موجودگی میں ہمیں سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے متحد کرنے کی کوشش کرنا۔ اس صورت میں کہ پاکستانی قومیت یکسر فنا ہو جائے۔ ایک عظیم بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ دیگر اقوام عالم کی طرح ہمارے سامنے بھی خدمت خلق کا معین مقصد ہے اور وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم پاکستانی روح کو منزہ اور محفوظ رکھیں۔ اندریں حالات اگر ہم قومیت متحدہ ہندیہ کے غلط اور خطرناک نظریہ کے لیے اپنے ہی قتل نامہ پر دستخط ثبت کر دیں تو یہ آئندہ نسلوں سے غداری اپنی تاریخ سے صریح ظلم اور انسانیت کے خلاف عظیم گناہ ہوگا اور اس سے براءت اور نجات ناممکن ہوگی۔

# فوج کے نام حضرت عمرؓ کا پیغام

## ۱۔ سعد بن ابی وقاصؓ کے نام

ذیل کا خط عقد الفرید میں بیان ہوا ہے یہ حضرت عمرؓ کا (جو مختصر نویس مشہور ہیں اور غالباً) یہ بھی) سب سے لمبا خط ہے اور اس کا مضمون عالی و فوجی اقدار پر مشتمل ہے۔

میں تم کو اور تمہاری فوج کو تاکید کرتا ہوں کہ

(۱) ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہیں کیوں کہ خدا کا خوف دشمن کے مقابلہ میں بہترین ہتھیار اور جنگ کی سب سے مؤثر چال ہے۔

(۲) تم اور تمہاری فوج دشمن سے جتنے چوکنا رہیں اس سے زیادہ "معاصی" سے ہوشیار رہیں کیوں کہ فوج کو دشمن سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا خود اپنے معاصی سے پہنچتا ہے۔

(۳) مسلمانوں کی فتح کا راز یہ ہے کہ ان کا دشمن گرفتار "معاصی" ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ہم دشمن پر فتح نہ پا سکیں، کیوں کہ ہماری تعداد اس سے کم ہے اور ہمارے ہتھیار اس کے ہتھیاروں سے گھٹیا ہیں، اگر "معاصی" میں ہم دشمن کے برابر ہوں تو وہ قوت میں ہم سے بڑھ جائے گا اور اگر ہم اپنی راست بازی کی قوت سے اس پر غلبہ نہ پا سکیں تو اپنی فوجی قوت سے یقیناً نہیں پا سکیں گے۔

(۴) تم گویا درہے کہ خدا کی طرف سے ایسے فرشتے مامور ہیں جو تمہارے چال چلن پر نظر رکھتے ہیں، جن کو تمہارے ہر فعل کا علم ہوتا ہے، ان سے غیرت کرو اور خدا کی نافرمانی (معاصی) سے بچتے رہو۔

(۵) یہ کہہ کر دشمن چوں کہ بُرا ہے اس لیے کبھی ہم پر فتح نہ پا سکے گا کیوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض قوموں پر ان سے بڑی قومیں غالب آجاتی ہیں جس طرح مجوسی کافر بنو اسرائیل پر غالب آگئے جب کہ بنو اسرائیل نے نافرمانیوں سے خدا کو ناراض کیا۔

(۶) خدا سے دعا مانگو کہ تمہارے اندر معاصی سے بچنے کی طاقت پیدا ہو اور یہ دعا اسی خلوص سے ہو جس سے دشمن پر فتح پانے کی دعا مانگتے ہو، میں بھی اپنے اور تمہارے لیے خدا سے یہ دعا مانگتا ہوں۔

(۷) کوچ کی حالت میں فوج کے آرام کا خیال رکھو اور اتنا زیادہ ان کو نہ چلاؤ کہ تھک جائیں۔

(۸) ایسی جگہ ٹھہرنے سے ان کو نہ روکو جہاں سہولت و آرام ہو، تاکہ وہ جب دشمن کے مقابل ہوں تو ان کی توانائی بحال ہو۔

(۹) دوران کوچ میں ہر ہفتہ ایک دن اور ایک رات قیام کرو تاکہ فوج کو آرام ملے اور وہ اپنے ہتھیار اور سامان درست کر سکیں۔

(۱۰) جن لوگوں سے تم صلح کر دیا جو جزیہ دے کر تمہاری پناہ میں آجائیں، ان کی بستیوں سے دور پڑاؤ ڈالو اور کسی کو ان بستیوں میں نہ جانے دو سوائے اس شخص کے جس کی سیرت پر تم کو پورا پورا بھروسہ ہو۔

(۱۱) تمہارا کوئی سپاہی یا فوجی افسر بستی والوں کی کسی چیز پر ناجائز قبضہ نہ کرے، کیوں کہ تم نے ان کی حفاظت ان کی جان مال اور آبرو کے احترام کا ذمہ لیا ہے اور یہ ایک آزمائش ہے جس طرح اپنے مواخذات سے عہدہ برآ ہونے کی ذمہ داری ان کے (ذمیوں ذمیوں اور اہلِ معاہدہ) کے لیے ایک آزمائش ہے، جب تک وہ اس ذمہ داری کو خوبی سے انجام دیتے رہیں، تمہارا فرض ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

(۱۲) جن لوگوں سے تم نے صلح کی ہو ان پر ظلم و ستم کر کے دشمن پر فتح پانے کی خواہش نہ کرو۔

(۱۳) جب دشمن کے علاقہ میں پہنچو تو تحقیق حال کے لیے جاسوس بھیجو اور دشمن کے حالات سے پوری طرح باخبر رہو۔

(۱۴) تمہارے پاس جاسوس اور مشورہ کے لیے ایسے عرب یا مقامی غیر عرب ہوں جن کی نیک نیتی اور حق گوئی پر تم کو اعتماد ہو کیوں کہ عادتاً جھوٹا اگر سچی خبر بھی لائے تو تم کو اس سے فائدہ نہ ہوگا اور دھوکہ باز تمہارے خلاف جاسوسی کرے گا نہ کہ تمہارے حق میں۔

(۱۵) دشمن کے علاقہ سے قریب پہنچ کر تم کو چاہیئے کہ ادھر اُدھر رسالے بھیجو اور دشمن اور اپنے درمیان دستے پھیلا دو، یہ دستے رسد اور فوجی اہمیت کی چیزوں کو دشمن تک پہنچنے سے باز رکھیں اور رسالے دشمن کی دفاعی خامیاں دریافت کریں۔

(۱۶) رسالوں کے لیے ایسے لوگ منتخب کرو جو بہادر اور صائب رائے ہوں اور ان کو تیز رفتار گھوڑے دو۔

(۱۷) دستوں میں ایسے لوگ ہوں جن کو جہاد کی لگن ہو اور جو تلواروں کے نیچے پامردی سے ڈٹے رہیں۔

(۱۸) رسالوں اور دستوں کے انتخاب میں ذاتی دلچسپی کو دخل نہ دو، کیوں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مشن کو جو نقصان پہنچے گا اور تمہاری لیاقت پر جو حرف آئے گا وہ اس فائدہ سے کہیں زیادہ ہوگا جو دوستوں کے ساتھ رعایت کرنے سے ممکن ہے۔

(۱۹) رسالے اور دستے اسی سمت کو بھیجو جہاں ان کے شکست کھانے، نقصان اٹھانے یا تباہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

(۲۰) جب دشمن تمہارے سامنے آئے تو اپنی بچھڑی ہوئی فوجیں، رسالے اور دستے سب اپنے قریب جمع کر لو اور اپنی قوت اور چالوں سے کام لینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

(۲۱) جب تک دشمن خود حملہ آور نہ ہو لڑنے میں جلدی نہ کرو، تاکہ تم اس کی فوجی خامیوں اور دفاعی کمزوریوں سے واقف ہو سکو اور اپنے گرد و پیش سے مقامی باشندوں کی طرح باخبر ہو جاؤ، اس واقفیت کے بعد تم اس بصیرت سے لڑ سکو گے جس سے دشمن لڑنے پر قادر ہوگا۔

(۲۲) اس کے علاوہ تم اپنی فوج پر پہرہ دار مقرر کرو اور حتی المقدور شب خون سے چوکنا رہو۔

(۲۳) اگر کوئی ایسا قیدی جس کو امان نہ دی گئی ہو تمہارے پاس لایا جائے تو اس کی گردن مار دو تاکہ دشمن کے دل میں ڈر بیٹھ جائے، اللہ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا نگہبان ہے اور اسی کی مدد پر فتح کا دار و مدار ہے۔

## ۲

سعد نے فتح قادسیہ کے بعد مرکز کو خوش خبری کا خط

# انصاف کے معاملہ میں کسی کو یہ اختیار نہیں کہ ایک کے ساتھ انصاف کرے اور ایک کے ساتھ نہ کرے

بھیجا اور اس میں لکھا کہ جنگ ختم ہونے کے دوسرے دن شام سے سات سو سترّ مجاہدوں کی کمک وارد ہوئی ہے، میں نے ان کو مالِ غنیمت میں شریک نہیں کیا اور اس باب میں آپ کی رائے کا منتظر ہوں، جواب میں حضرت عمرؓ نے لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سلام علیک، میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اس کے نبی محمدؐ پر درود بھیجتا ہوں، تمہارا خط ملا، اس فتح کے لیے خدا کا بہت بہت شکر گذار ہوں جو تمہارے ہاتھوں اس نے ہم کو عطا کی، خدا نے مجھ کو تمہارا حاکم اعلیٰ بنا کر میری آزمائش کرنا چاہی ہے جس طرح تم کو میرا ماتحت کر کے تمہاری آزمائش کرنا چاہی ہے، وانی واللہ لو أحصی شیئاً من امورکم فاعلمہٗ وامّا اذا اجتمع صلح (؟) جب حاکم ہمدرد ہو اور رعایا اس کی خیر اندیش تو حاکم کا فرض ہے کہ رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور رعایا کا فرض ہے کہ وہ اس برتاؤ کی قدر کرے اور حاکم کی شکر گزار ہو، مالِ غنیمت ان لوگوں کا حق ہے جو جنگ میں شریک ہوں اور جو لوگ بطور کمک جنگ ختم ہونے کے تین دن کے اندر آئیں ان کو بھی مالِ غنیمت کا کچھ حصہ ملنا چاہیئے تمہارے غلام اور موالی اگر جنگ شروع ہونے کے تین دن کے اندر شریک ہوں تو وہ بھی مالِ غنیمت سے حصہ پائیں گے جو مال و متاع بطور غنیمت تمہارے قبضہ میں آئے اس کی تقسیم انصاف سے کرو۔

## ۳

زہرہ بن حویہ حتمی سعد کے مقدمۃ الجیش کے ایک نوعمر، نڈر اور چابک دست کمانڈر تھے، ہر خطرہ میں گھس جاتے تھے، تلوار بازی اور تیر اندازی میں ان کو غیر معمولی مہارت تھی۔ جنگ قادسیہ میں بہت سے ایرانی ان کی تلوار کا شکار ہوئے، ان میں ایک بہت بڑا فوجی افسر جالینوس تھا، زہرہ نے اس کی وردی اور ہتیار اتار لیے اور وردی پہ اتنا قیمتی کام تھا کہ کہا جاتا ہے اس کی قیمت ستر ہزار درہم (تقریباً چالیس ہزار روپے) تھی۔ زہرہ وردی پہن کر سعد کے پاس آئے تو سعد نے وردی اتار لی اور ترشی سے کہا کہ تم نے میری اجازت کا بھی انتظار نہ کیا اور وردی پر قابض ہو گئے، زہرہ کو یہ سختی ناگوار ہوئی اور انھوں نے شکایت کا خط مرکز کو لکھا اور سعد نے بھی زہرہ کی بے ضابطگی اور اس قدر قیمتی وردی پر تن تنہا قابض ہونے کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے ذیل کا خط بھیجا۔

(۲) "تم زہرہ جیسے شخص سے اُلجھے، حالاں کہ تم کو معلوم ہے کہ اس نے جنگ کی آگ میں کیسی کیسی پیٹیں کھائی ہیں اور ابھی یہ آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے

(۳) سخت گیری سے اس کا حوصلہ نہ توڑو اور نہ اس کا دل برا کرو۔

(۴) وردی اور ہتیار جو اس نے جالینوس کو مار کر لیے ہیں بحال کر دو اور اس کو دوسرے مجاہدین قادسیہ سے پانچ سو درہم زیادہ عطا (سالانہ تنخواہ) دو۔"

## ۴

ذیل کے دو خط سعد کے ان دو مراسلوں کے جواب میں ہیں جن میں انھوں نے فتح قادسیہ کے بعد حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا تھا کہ سواد کے رئیسوں اور کاشتکاروں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

پہلے مراسلہ میں انھوں نے لکھا، سواد کے بعض رئیس دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے خالد اور مثنیٰؓ کی فتوحات کے زمانہ میں ان سے معاہدے کیے تھے، مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ خالد اور مثنیٰؓ سے معاہدہ کرنے والے سارے رئیس بانستشار، بانقیا، باسما اور اُلیس الآخرۃ، معاہدے توڑ کر باغی ہو گئے تھے، ان رئیسوں کا دعوےٰ ہے کہ ایرانیوں نے ان کو عہد شکنی اور مسلمانوں سے لڑنے پر مجبور کیا، تاہم نہ تو وہ ہم سے لڑے اور نہ اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگے۔ دوسرے مراسلہ کا مضمون یہ تھا:۔ اہلِ سواد جنگ کے زمانہ میں گھر بار چھوڑ کر محفوظ جگہ چلے گئے تھے اور ایک جماعت نے مدائن میں پناہ لی تھی۔ جنگ کے بعد متعدد رئیس ہمارے پاس آئے جنھوں نے پاس عہد کیا تھا اور ہمارے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے، ہم نے ان کے وہ معاہدے جو انھوں نے ہمارے پیش رو مسلمانوں (یعنی خالد اور مثنیٰؓ) سے کیے تھے مشروط طور پر بحال کر دیے ہیں۔ بتلایئے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے جو

(۱) معاہدوں پر قائم رہے۔

(۲) جو گھر بار چھوڑ کر چلے گئے۔

(۳) جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو عہد شکنی اور لڑنے پر مجبور کیا گیا مگر وہ نہ تو بھاگے اور نہ لڑے۔

(۴) جو مقیم رہے اور جزیہ دینے کو تیار ہیں، امیر المؤمنین ہم ایک بڑے دل نشین اور سرسبز ملک میں ہیں جہاں کی بستیاں اور اراضی جنگ کے زیاں ثمرا تجڑ گئی ہیں، ہماری رائے ہے کہ اہلِ سواد کی دلجوئی کی جائے اور ان کے ساتھ نرم برتاؤ کیا جائے۔ اس سے سواد کی زراعت اور خوشحالی قائم رہے گی اور دشمن کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔

حضرت عمرؓ نے خط پا کر ایک عام جلسہ میں تقریر کی اور حاضرین کو دونوں مراسلوں کے مضمون سے آگاہ کر کے ان کی رائے معلوم کی عمائدین صحابہ نے کہا، جو معاہدہ رئیس اپنے علاقوں میں رہے ہوں اور انھوں نے ایرانیوں کے ساتھ تعاون نہ کیا ہو ان سے جو معاہدے کیے گئے ہوں وہ برقرار رکھے جائیں۔

(۲) جو معاہد اس بات کے مدعی ہوں کہ ان کو ایرانیوں نے نقضِ عہد اور جنگی تعاون پر مجبور کیا، مگر انھوں نے نہ عہد توڑا اور نہ جنگی ہمدردی، ایسے لوگوں کے حق میں اگر شہادت مل جائے تو ان کے معاہدوں کو منسوخ کر دیا جائے اور ان سے نئے معاہدے کیے جائیں۔

(۳) جو لوگ گھر بار چھوڑ کر چلے گئے ہوں ان کے معاملہ میں مسلمانوں کو اختیار ہے کہ چاہے ان سے مصالحت کر کے جزیہ گذار بنا لیں یا ان کی اراضی واملاک پر خود قابض ہو جائیں۔

(۴) جو لوگ اپنے گھر مقیم رہے ہوں اور مسلمانوں کی سیادت تسلیم کریں ان پر جزیہ لگایا جائے ورنہ ان کو گھر بار چھوڑ کر جلاوطن ہونے پر مجبور کیا جائے۔

## پہلے مراسلہ کا جواب

"واضح ہو کہ خدائے بزرگ و برتر نے ہر معاملہ میں انسان کو (بشرطِ مجبوری) ترک و اخذ کا حق دیا ہے مگر دو معاملے اس سے مستثنیٰ ہیں، انصاف اور خدا کی یاد۔ خدا کی یاد میں کسی انسان کو کسی حال میں ترک و اخذ کا حق نہیں ہے، کیوں کہ خدا چاہتا ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا جائے۔ انصاف کے معاملہ میں بھی کسی کو یہ اختیار نہیں کہ ایک کے ساتھ انصاف کرے اور ایک کے ساتھ نہ کرے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ عزیز و بیگانہ، دوست و دشمن، مصیبت و شادمانی، ہر شخص اور ہر حال میں انصاف سے کام لے۔ انصاف اگرچہ نرم نظر آتا ہے، مگر اس میں ظلم و

باطل کے توڑنے اور خدائی نافرمانی کو روکنے کی بے پناہ قوت ہے۔

(۲) جو اہلِ سواد معاہدے پر قائم رہے ہوں اور انھوں نے کسی طرح تمہارے خلاف کارروائی نہ کی ہو تو وہ تمہاری امان میں ہیں اور ان سے جزیہ وصول کیا جائے۔

(۳) جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو عہد شکنی پر مجبور کیا گیا، مگر انھوں نے تم سے نہ تو جنگ کی نہ جلا وطن ہوئے، تو تم کو اختیار ہے چاہے ان کا دعوےٰ مان لو اور چاہے اس کو رد کر کے مرحوم معاہدوں کو برقرار نہ رکھو اور ان کو ایرانی علاقہ میں پہنچا دو۔

## دوسرے مراسلہ کا جواب

"جو رئیس اپنے علاقوں میں مقیم رہے ہوں ان کے ساتھ اہلِ معاہدہ کا سا معاملہ کیا جائے، کیوں کہ وہ گھر بار چھوڑ کر نہیں گئے اور نہ انھوں نے تمہارے خلاف کوئی کارروائی کی۔

(۲) جن کاشت کاروں کا طرزِ عمل یہ رہا ہو ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جائے۔

(۳) جو رئیس دعویٰ کریں کہ ان سے معاہدے کیے گئے تھے اور انھوں نے تمہارے خلاف ایرانیوں کے ساتھ تعاون نہ کیا ہو، اور ان کے دعویٰ کی تائید میں ثبوت فراہم ہو تو وہ بھی جزیہ دے کر مسلمانوں کی امان میں رہیں گے اور اگر ثبوت ان کے خلاف بہم ہو تو ان کے پرانے معاہدے منسوخ کر دیے جائیں اور ان سے نئے معاہدے کیے جائیں۔

(۴) جن رئیسوں نے ایرانیوں کے ساتھ تعاون کیا ہو اور گھر بار چھوڑ کر چلے گئے ہوں تو ان کے معاملہ میں تم کو خدا کی طرف سے اختیار ہے کہ ان کو بلا کر ان کی اراضی اور املاک لوٹا دو اور وہ جزیہ دے کر مسلمانوں کی امان میں رہیں، اور اگر وہ واپس آنا پسند نہ کریں تو ان کی اراضی و املاک آپس میں بانٹ لو۔"

### ۵

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج، بلاذری نے فتوح البلدان اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حضرت عمرؓ کا ایک خط نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سواد فتح کر کے مطالبہ کیا تھا کہ وہاں کی اراضی اور باشندے ان کی ملک میں دے دیے جائیں، مگر حضرت عمرؓ نے یہ مطالبہ نہ مانا اور ذیل کا خط لکھا۔

"تمہارا خط ملا، تم نے لکھا ہے کہ مسلمان وہ اراضی آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جس کو انھوں نے بزورِ شمشیر فتح کیا ہے۔

(۲) میرا یہ خط پا کر دیکھو کہ مسلمان تمہارے لشکر میں شکست خوردہ دشمن کا کیا سامان اور مویشی لائے ہیں۔ اس سامان کو خمس نکال کر لشکر پر تقسیم کر دو۔

(۳) اور اراضی، دریاؤں اور نہروں کو ان لوگوں کے پاس چھوڑ دو جو ان کو کاشت کرتے رہے ہیں تاکہ ان سے جو خراج وصول ہو وہ مسلمانوں کی تنخواہوں اور وظیفوں میں دیا جا سکے، اگر تم نے سواد کی اراضی فوج میں تقسیم کر دی تو بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے کچھ نہ بچے گا۔

(۴) میں نے تم کو ہدایت کی تھی کہ جب کسی قوم سے مقابل ہو تو لڑنے سے پہلے اس کو اسلام کی دعوت دو۔

(۵) اور یہ کہ جو شخص جنگ سے پہلے دعوت قبول کرے گا۔ اس کی حیثیت دوسرے مسلمانوں کی سی ہو گی، اس کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں پر عائد ہیں اور اس کو مالِ غنیمت میں حصہ بھی ملے گا۔

(۶) اور جو شخص جنگ اور شکست کے بعد اسلام لائے گا، اس کی حیثیت بھی مسلمان کی سی ہو گی لیکن اس کی دولت کے مالک مسلمان ہوں گے، کیوں کہ اسلام لانے سے پہلے اس کی دولت مسلمانوں کی ملک ہو چکی ہے۔"

### ۶

جسر کی شکست میں چار ہزار مسلمان قتل اور غرق ہوئے، دو ہزار بھاگ کر صحراؤں اور مدینہ میں چھپ گئے اور مثنیٰ بن حارثہ کے پاس صرف تین ہزار کی جمعیت رہ گئی، ایرانیوں سے نمٹنے کے لیے انھوں نے مرکز سے کمک طلب کی۔ حضرت عمرؓ نے یمن کے قبیلہ بجیلہ کو جو اس وقت مدینہ آیا ہوا تھا، مثنیٰ کی مدد کو بھیجنا چاہا، مگر ان کو عراق کی بجائے شام جانے پر اصرار تھا، اس کی ایک وجہ یہ تھی جسر کی تباہی سے لوگ ڈرے ہوئے تھے اور دوسرے شام کے محاذ پر یمن کے بہت سے قبیلے جا چکے تھے اور بجیلہ اپنے ہم نسب قبائل کے ساتھ رہنے کے خواہش مند تھے، وقت کے شدید تقاضا کے زیرِ اثر حضرت عمرؓ نے بجیلہ کو ایک رعایت دے کر عراق کی طرف مائل کرنا ضروری سمجھا، انھوں نے جریر سے کہا جو بجیلہ کے لیڈر تھے کہ اگر تم عراق کے محاذ پر چلے جاؤ تو تمہیں اور تمہارے قبیلہ کو فتوحات کے خمس کا چوتھائی حصہ دیا جائے گا، قبیلہ نے یہ پیشکش منظور کی۔ یہ طبری (۴/ ۰۰۰) کے راویوں کا قول ہے، اس کے علاوہ ایک روایت ہے جسے فتوح البلدان (ص ۲۶۷) نے نقل کیا ہے اور جس کی بنیاد پر ذیل کا خط وارد ہوا ہے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ اراضی و غنائم کے چوتھائی حصہ کا وعدہ کیا تھا۔ ایک تیسری روایت تو یہاں تک ہے کہ تین برس تک قبیلہ بجیلہ کو سواد کا چوتھائی خراج بھی دیا جاتا رہا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے جریر کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ سارے مسلمانوں کے حق میں اس آمدنی سے دستبردار ہو جائیں اور وہ ہو گئے۔ جلولا میں ایرانیوں نے دوسری بڑی شکست کھائی اور سواد کا سارا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا تو بجیلہ نے فتوحات کا چوتھا حصہ طلب کیا، سعد نے اس کی اطلاع مرکز کو دی تو یہ خط آیا۔

"اگر جریر یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی فوج اور انھوں نے مؤلفۃ القلوب کے خاص حصہ کی خاطر جنگ کی تھی تو ان کو یہ حصہ دے دو اور اگر انھوں نے جنگ اسلام کی خاطر اور انعامِ ایزدی کے حصول کے لیے کی تھی تو وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح ہیں، ان کو وہی فوائد حاصل ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کو ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو دوسرے مسلمانوں پر ہیں۔"

## ۷۔ عتبہ بن غزوان کے نام

اُبلہ ۱۴ھ میں صحابی عتبہ بن غزوان کی قیادت میں فتح ہوا، یہ اہم بندرگاہ دجلہ اور فرات کے دہانہ کے پاس بصرہ سے کوئی چودہ میل شمال مشرق میں خلیج فارس پر واقع تھا، جہاں ہندوستان، جزائر ہند اور چین سے تجارتی جہاز آتے تھے، اس پر فارسیوں کا قبضہ تھا، یہاں کے مالِ غنیمت سے ایک شخص کو حصہ میں ایک بڑی دیگچی ملی جو پیتل کی خیال کی گئی مگر واقعۃً سونے کی تھی، جب حقیقت حال کا علم عتبہ کو ہوا تو انھوں نے حضرت عمرؓ سے استفسار کیا کہ آیا دیگچی واپس لے لی جائے یا پانے والے کے پاس رہنے دی جائے۔

"اگر سلمہ دیگچی پانے والے کا نام، خدا کی قسم کھا کر کہے کہ اس نے دیگچی کو پیتل کا سمجھ کر لیا تھا تب تو اس کے حق میں بحال رکھی جائے، ورنہ اس کو مسلمان آپس میں بانٹ لیں۔"

پبلشر: غلام نبی جانباز مرزا نے وفاق پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر ۴۸/۲ گلشن کالونی شادباغ لاہور سے شائع کیا۔


سب سے اچھے • سب سے سستے
پاکستان کے نمبر 1 پرزہ جات سائیکل
پی-سی-ٹی

کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کے

زیر اہتمام عظیم الشان

نظام شریعت

# کانفرنس

منعقدہ : ۴، ۵۔ اکتوبر ۱۹۷۹ بمقام منٹو پارک ◎ لاہور

پاکستان کی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوگی :

جسمیں

ملک بھر سے ہزاروں مشائخ، علما، وکلا، طلبہ، مزدور، کسان اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے ہزاروں درد دل رکھنے والے مسلمان شریک ہونگے۔

مولانا عبید اللہ انور صدر
مولانا محمد اجمل خاں جنرل سیکرٹری

و دیگر اراکین
مجلسِ استقبالیہ
کل پاکستان نظام شریعت کانفرنس لاہور